TEXT CUT WITHIN THE BOOK ONLY

problem book

UNIVERSAL LIBRARY
OU_222278
UNIVERSAL LIBRARY

اُردو مرکز لائبریری

اُردو ادب کے معیاری مختصر افسانوں کا علمی انتخاب

منتخب افسانے

جلد ہفتم

مرتبہ

مولینا تاجور نجیب آبادی پروفیسر دیال سنگھ کالج ایڈیٹر اتحاد

بہ اعانت

حضراتِ اراکین اُردو مرکز لاہور

بیسرز عطر چند کپور اینڈ سنز پبلشر لاہور

۹۹۳۸
Checked 1966
CHECKED 1975
Checked

اُردو مرکز لاہور

ملک کی واحد اکیڈمی (اردو مرکز لاہور) انتخاب ہفت کشور پنجاب کے دارالسلطنت لاہور میں ذیل کے اہم مقاصد کی تکمیل کیلئے ایک بڑے سرمایہ سے قائم کی گئی ہے۔

اردو لٹریچر کے ذخیرۂ بیکراں میں سے اس جاندار اور مفید حصہ کو جو محفوظ رکھنے کے قابل ہو حتی الامکان تاریخی ترتیب کیساتھ مجلدات میں شائع کرنا۔

1952 اُردو زبان کی مکمل انسائیکلوپیڈیا کی تالیف۔

ایک جامع اُردو لغات کی ترتیب۔

اردو مرکز کی مجلس ادبا (جو درحقیقت اردو زبان کیلئے ایک ادبی دارالافتا ہے) کے ذریعہ علمی ضروریات کے مناسب جدید الفاظ کی اختراع و متنازع فیہ امور کے متعلق ناطق فیصلہ کرنا۔

ایک باوقار علمی جماعت جسمیں ملک کے سربرآوردہ اہل قلم اور منتخب انشا پرداز شریک ہیں۔ اُردو مرکز مذکورہ بالا اہم مقاصد میں سے پہلے مقصد کی تکمیل پر اپنی تمام تر توجہ مبذول کئے ہوئے ہے۔ اسکی پہلی زرین کوشش نفیس گرانقدر مجلدات کی صورت میں قدرشناس نگاہوں کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ آنریبل سر شیخ عبدالقادر بالقابہ۔ خان بہادر شیخ نور الٰہی۔ آئی ای۔ایس۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی جیسے نقادانِ ادب کے مشوروں کے ماتحت یہ مجلدات جماعت اردو مرکز نے ترتیب دیے ہیں۔ قدرشناس اہل نظر نے حوصلہ افزائی فرمائی۔ تو ہم کم و بیش ڈیڑھ سو مجلدات شائع کرکے اردو مصنفین کو بڑی بڑی لائبریریوں سے بے نیاز کردینگے۔

تاجور نجیب آبادی پروفیسر دیال سنگھ کالج ایڈیٹر اتحاد چیف ایڈیٹر اردو مرکز لاہور

کیمبرج آرٹ پرنٹنگ ورکس لاہور واقع گوال منڈی میں باہتمام بابو گوردتا مل چھپا

Checked 1969.

فہرست جلد ہفتم

نمبر شمار	فسانہ	فسانہ نگار	صفحہ
۱	ماہ جبیں اندرا	مولینا سید عبدالراشد الخیری دہلوی ایڈیٹر "عصمت"	۱
۲	ضعیفہ اور اسکا بیٹا	میاں تصدق حسین صاحب خالد ایم اے - ای - اے - سی -	۲۰
۳	دل کا قصور	حضرت فاخر ہریانوی بی - اے	۳۲
۴	شہید تغافل	مسٹر عاشق حسین بٹالوی بی اے -	۴۰
۵	جذب دل کی دو تصویریں	سید سلطان حیدر جوش ڈپٹی کلکٹر -	۵۱
۶	خورشید و قمر	حضرت باغبان	۶۰
۷	ذکریا کی عروسی	میر افضل علی صاحب ایم اے انکم ٹیکس افیسر	۹۰
۸	سزائے اعمال	پنڈت بدری ناتھ سدرشن جرنلسٹ	۱۰۳
۹	مرزا مغل کی بیٹی	مصور فطرت خواجہ حسن نظامی دہلوی	۱۱۶
۱۰	جلا وطن	ڈاکٹر غلام عباس خانصاحب ایم اے پروفیسر گورنمنٹ کالج گجرات -	۱۲۴
۱۱	گرگٹ	سید بشیر الدین صاحب بی اے (علیگ)	۱۳۶

جلد ہفتم

ماہ جبیں اندرا

علامہ راشد الخیری دہلوی

آج سے کئی ہزار برس پہلے جب یہ سنسار موجودہ تمدن و تہذیب سے کوسوں دور تھا، گو آج کل کی بہت سی نعمتوں اور مصیبتوں کا اس وقت ظہور نہ ہو، مگر نظام عالم کی صورت یہ ہی تھی. جو آج صدیاں بیتنے اور جگ گذر جانے پر دکھائی دے رہی ہے، انسانی صورتیں ایسی ہی تھیں، پہلو میں دل اسی طرح کے تھے، مگر دل میں جو جب تھا وہ اب نہیں، اور جواب ہے وہ جب نہ تھا، پریم ان دلوں کا مسکن اور سچی محبت ان لوگوں کی زندگی تھی، نیلا سفید آسمان جو آج سروں پر چھایا ہوا ہے، جب بھی تھا، اور یہ ہی تیلی پچیلی دھرتی جو اب پاؤں سے لگ رہی ہے، اُس سمے بھی تھی، ان ہی دنوں کی ایک رات کا ذکر ہے آسمان پر سکون مطلق طاری تھا، چھوٹے چھوٹے تارے چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے، اور پورنماشی کا چاند جمنا کی لہروں کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا +

دریا کے کنارے ایک جوگی کی منڈھیا تھی. جس کے چاروں طرف

ریت کے ذرّے چمک رہے تھے، اندر ایک سادھو آسن جمائے تھا، اور پہلو میں ایک حُسن کی دیوی خاموش بیٹھی تھی، اس کی سوہنی صورت سنگار کی محتاج نہ تھی، قدرت نے اس کو اپنے ہاتھ سے گھڑا تھا، ایک ہلکی سی ملگجی ساڑھی اس کے نازک جسم کو چھپائے ہوئے تھی جس پر سیاہ اور لمبے بال افعی کی طرح لہرا رہے تھے، سفید بُرّاق پیشانی پر ہلکے سے تِلک نے موہنی مورت کو چار چاند لگا دئے تھے۔ چاند کی روشنی منڈھیا میں سے چھن چھن کر اس ماہ جبیں پر پڑ رہی تھی، اور چاند اس کے حُسنِ خدا داد پر عش عش کر رہا تھا، ہرن بارہ سنگھے، چکارے، اُس کے آس پاس کلیلیں کر رہے تھے، اور گو آرائشِ ظاہری کا اس کے حُسن میں پتہ تک نہ تھا، مگر محبّت کا سُرمہ آنکھ میں جھلک رہا تھا ؛

دریا، دریا کی لہریں، سوگئیں۔ منڈھیا کی پشت کے باغ پر اوس پڑنے لگی، کِھلے ہوئے پھول پتوں پر سر رکھ کر لیٹ گئے، بُلبل خاموش، بھونرے بیخبر، ہرن چوکڑیاں بھُولے، اور منڈھیا کی اگنی جلتے جلتے راکھ ہوگئی، ایک عالم سنسان تھا، کہ یہ نازنین انداز دلربایانہ سے اُٹھی۔ منڈھیا سے باہر آئی، چمکتے ہوئے چاند پر نظر ڈالی، اور ایک ٹھنڈا سانس بھرتی ہوئی گلاب کے تختہ پر پہنچی۔ ہوا اپنی نازک انگلیوں سے زلف عنبرین کے لچھے بنا رہی تھی۔ اور چاند کا سایہ لبِ نازک پر پروانہ وار گر رہا تھا، گلاب کے کٹہرا سے پھُول چاروں طرف کھلے ہوئے تھے، اور پچھلی رات کی ہوا خوشبو میں بسی ہوئی آہستہ آہستہ چل رہی تھی، نازنین ایک ایسی جگہ ٹھٹکی جہاں ہوا کی بدولت چشمہ کا شفاف پانی ایک سدا بہار گلاب کے پھُول کے بوسے لے رہا تھا، ٹھٹکی اور ٹھٹک کر تھمی، تھمی اور تھم کر بیٹھی، بیٹھی اور بیٹھ

کراہتی، اُٹھی اور اُٹھ کر منڈھیا میں آئی۔ اور حسرت سے ایک کونہ میں بیٹھ گئی، نرگسی آنکھوں سے آنسو کے قطرے ڈھلک ڈھلک کر نرم اور نازک رخساروں پر بہہ رہے تھے، اور پیشانی کا بَل قلب مضطرب کی دھڑکن ظاہر کر رہا تھا۔ ابھی یہ آنسو خشک نہ ہوئے تھے کہ جوگی نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا اور کہا "اندرا" +

اندرا۔ ہاں مہاراج!

جوگی۔ من کی چنتا دور ہوئی؟

اندرا۔ ہے مہاراج میری بنتی پر دھیان کیجئے اور اِس وشواش کو من سے دور کیجئے۔ راجوں کے راج سری مہاراج میں آپ کی چیری ہوں، دیا کیجئے، اور میری لاج رکھ لیجئے، ہے مہاراج! وہ مانس نہیں تھا رام چندر جی کا اوتار تھا۔ سُپنے میں درشن دیئے اور من موہ لیا +

جوگی۔ اندرا ہٹ جا! پرے ہو جا! تیرے جیو میں پریم نہیں، تو استری ہے، چاتر ہے، تو نے اے اندرا دھوکا دیا، میرے راج پاٹ کو دیکھ یہ تمام سنسار ایک دم میں بھلس دوں، جلا دوں، راکھ کر دوں، تو اے اندرا تو، اور، تیرا سینہ سب بھسم ہو جائیں، جا! جا! جا! اندرا! دور ہو جا!

(۲)

برسات کی اندھیری رات ہے، بادل امنڈ امنڈ کر آ رہے ہیں، اور گھٹا جھوم جھوم کر برس رہی ہے، جمنا کے اِس کنارے پر جہاں منڈھیا تھی۔ ایک عالیشان محل بنا ہوا ہے۔ جوگی مہاراج کا جوگ ختم ہوا، آج وہ اِس سرزمین کا راجہ ہے۔ بڑے بڑے رشی اور منی، گیانی اور ودیانی، ڈنڈوت کر رہے ہیں،

گنگا جی کا اشنان، مہاراج کی سالگرہ، اندرا کی سواری دیوی کے مندر پر دیا روشن کرنے جاتی ہے۔

مہارانی اندرا کے حسن کا سکہ روئے زمین پر بیٹھا ہوا تھا، اس کی آن بان اسکی سج دھج یوں ہی ہزاروں دل پامال کر چکی تھی۔ اس وقت اس کا بناؤ سنگار ایک قیامت تھی کہ چاروں طرف لوٹ رہی تھی۔ کوہ نور کو شرمانے والے جواہر نگار بندے کانوں سے سرگوشیاں کر رہے تھے اور سات لڑی کا زرے موتیوں کا گلوبند سینہ پر جھلمل جھلمل کر رہا تھا، پکھراج اور نیلم کی چوڑیاں دستِ حنائی کے آگے سر بسجود تھیں، گورا رنگ اور رنگ میں ملاحت، زریں لباس، گلابی رنگت کتابی چہرہ قاتل صورت، آفت کی رفتار، قیامت کی گفتار، محبت کی کھری قاف کی پری، نشۂ عشق میں چور، اندرا جنت کی حور، راجہ کے روبرو پہنچی۔ چرن لیئے، ڈنڈوت کی اور یہ اشیرباد دی، مہاراج کا راج پاٹ رہتے سنسار تک +

راجہ یوں ہی اندرا کے نام کا دیوانہ تھا، صورت دیکھتے ہی دل ہاتھ سے نکل گیا، پچھلی باتیں بھول بسر گئیں، بے اختیار ہو کر اٹھا اور دیوانہ وار پیشانی کو بوسہ دیا +

راجہ۔ اندرا! مہارانی اندرا! اس موہنی صورت میں یہ من، اور اس من میں یہ کھوٹ +

اندرا۔ سری مہاراج! میرے من میں مالن کی چنتا نہیں، وہ راجہ جی کا اوتار ہے اس کے برہ کی ماری ہوں، اور اس کی چنتا دور نہیں ہوتی +

راجہ۔ ہٹ ہٹ، ہٹ جا! اندرا چلی جا دور ہو جا +

(۳)

پرستش کے قابل ہے شاہجہان کی وہ مقدس سرزمین جس پر اندرا جیسی حُسن کی دیویاں جو ایک عالم سے اپنی وفاداری کی داد لے گئیں۔ پیدا ہوئیں! دنیائے تاریخ، ان متبرک ناموں کو آنکھوں پر رکھ کر ان کے کارناموں پر قربان ہوگی، اور جب تک فانی دنیا میں شاہ جہان آباد کا وجود ہے۔ عشق اِس سرزمین کا طواف اور محبّت جُھک جُھک کر سجدے کریگی، عقل رسا آج تک حیران ہے، قیاس کام نہیں کرتا اور ذہن مجبور ہے کسے امید تھی۔ کہ رانیوں کی رانی خلوص کی راج دھانی جگ کی دُلاری۔ اندرا پیاری حُسن کی کان، والی ملک کی جان، صرف اسی صورت پر جو خواب میں دیکھی عمر عزیز قربان کردے گی!

شاہ جہان آباد والے اسکا احسان نہ مانیں، اور ہندوستان اس کے نام سے لاعلمی ظاہر کرے۔ مگر یوروپ اس کی ہر ادا پر مٹتا رہا اور آج بھی کہ سینکڑوں ہزاروں برس گذر گئے، یوروپ کے عجائب خانے اسکی تصویر پر ناز کر رہے ہیں *

دِلّی اِس سے انکار نہیں کرسکتی۔ کہ محبّت کا پہلا فانوس اندرا کے ہاتھوں اس کے کھنڈروں میں روشن ہوا، ثابت قدمی نے اسکے حوصلے بڑھائے عشق نے تاج شاہانہ سر پر رکھا۔ اسی کا صدقہ ہے کہ آج اس وقت سینکڑوں خاندان اس کے نام سے پل رہے ہیں، راجوں کے راجہ اور بادشاہوں کے بادشاہ جن کی آج ہڈیاں بھی گل کر خاک ہوگئیں، اس کا کلمہ پڑھتے رہے، کِس کا منہ ہے کہ اندرا جیسی ماہ جبیں پر بیوفائی کا الزام لگادے رانی نہیں چیری اور چیری نہیں کمیری سہی، مگر پہلو میں وہ دل رکھتی تھی،

جس پر آج کے دم تک حُسن کی مجسّم دیویاں شکریہ کے پھُول چڑھا رہی ہیں ✤ اللہ بس باقی ہوس ! اندرا محبّت کی لاج رکھ گئی ! اور ایک عالم کو دکھا دیا ! خاک ہندوستان سے ایسی وفادار روح پیدا ہوئی جسکا جواب دنیا کے باقی حصّوں سے آجتک نہ ملا ✤

اب تک نہیں تو اب اور کل تک نہیں تو آج اِسی ہندوستان والے سینکڑوں ہزاروں اس ماہ جبیں پر جو محبّت کی رسیا آنکھوں کو حسن کا جلوہ دکھا گئی جس کی ہر ادا بجلی کی طرح دلوں پر گری جس کا ہر انداز تیر کی مانند کلیجوں میں گھُسا۔ بیوفائی کا الزام لگائیں گے۔ مگر ان ہی سنگ دلوں میں دو چار نہیں لاکھوں کروڑوں ایسے بھی نکلیں گے۔ جو مہارانی اندرا کے اس استقلال کی داد دیں۔ مٹ گئی، اجڑ گئی، برباد ہو گئی، سینہ پرخون کی ندیاں بہیں بڑے بڑے جان نثار آنکھوں کے سامنے زمین میں لوٹ گئے، مگر محبّت کی دھن میں فرق نہ آیا۔ نت نئے داغ کلیجے پر لگے۔ اور انوکھی انوکھی مصیبتیں سر پر ٹوٹیں۔ لیکن جس صورت پر دِل نثار کیا۔ اس کی یاد ہاتھ سے نہ دی ✤

ہمیں یہ لکھنے میں مطلق تامل نہیں۔ کہ راجہ اندر کی اس دعا میں کہ اِندرا ایک روز اپنے محبوب کے گلے لگے گی۔ سب سے بڑی سفارش اس کی سندر صورت تھی۔ اور گو زمانہ کی رائے ہمارے موافق نہ ہو مگر ہم علی الاعلان کہیں گے کہ راجہ جو کچھ بھی تھا انسان تھا اندرا حُسن کی وہ پوٹ تھی۔ کہ بارہا فرشتوں نے اس پر درود پڑھی ✤

ہم اب کہتے ہیں کہ اندرا گری پڑی عورت نہ تھی۔ اندرا وہ نازنین تھی کہ کوہ نور جیسے ہیرے اسکے ادنےٰ خادم اور تخت طاؤس اس کا

معمولی غلام *
زمانہ کتنا ہی بد تہذیب ہو جائے اور انصاف کی آنکھوں پر کیسے ہی باریک پردے پڑ جائیں۔ لیکن شاہ جہان آباد اور اس کی پوتز دھرتی مہارانی اندرا کا نام تادم واپسین کلیجہ سے لگا رکھے گی *

(۴)

موسم وہ نہیں، مگر وہی جمنا کا کنارہ اور عالی شان محل، سہ پہر کا وقت ہے۔ راجہ ایک طلائی مسہری پر لیٹا ہے۔ پہلو میں رانی اندرا ہے۔ اور گو اس کا جگر حرارت عشق سے تڑپ رہا ہے۔ مگر نازک ہاتھ راجہ کے سر پر مورچھل کر رہے ہیں۔ گرمی قیامت خیز ہے، لو کے تند و تیز جھونکے کائنات کی ہر شے کو جھلسا رہے ہیں۔ لیکن اندرا کی سندر صورت نے راجہ کو سب تکلیفیں بھلا دیں۔ تاج شاہانہ اندرا کی گود میں ہے۔ اور محبت بھری نظریں اس کے رخ نازک پر!

راج دلاری نہیں فرشتوں پیاری اندرا اس وقت سبز لباس میں تھی۔ موسم بہار اسکے قدموں پر نثار ہو رہا تھا۔ اور نسرین و یاسمین اس کی گود میں لوٹ رہے تھے۔ راجہ اپنی خوش قسمتی پر فخر کرتا تھا۔ اندرا جیسی نازنین پہلو میں تھی، یارائے ضبط نہ رہا تو اٹھا اور کہنے لگا!

مہارانی، یہ سیس تیرے چرن پر ہے۔

اندرا۔ ہے مہاراج! اندرا، باندی ہے، اس کی لاج تمہارے ہاتھ۔ اتنا کہکر اندرا نے اپنے دست سیمیں راجہ کے گلے میں ڈال دئے۔ درو دیوار، آسمان اور زمین المختصر کائنات اور کائنات کا ہر ذرہ راجہ کی تقدیر پر حسرت سے نظر ڈال رہا تھا۔ دونوں کی آنکھ سے آنسوؤں کی ندیاں

بہہ رہی تھیں۔ سبز اوڑھنی کا سرا اندرا کے سر سے ڈھلک کر کاندھے پر آ پڑا تھا۔ حسن کی دیوی اس وقت محبت کی پوری تصویر تھی، ہاتھ راجہ کے گلے میں تھے اور دِل یاد دلدار میں ❖

(۵)

اِن خیالوں کو مدتیں ہوئیں، وہ باتیں کہانیاں اور وہ راز و نیاز فسانے ہو گئے، آج جمنا کی لہریں راجہ کی موت کا نوحہ پڑھ رہی ہیں۔ شہر پر ایک سناٹا چھایا ہوا ہے۔ عالیشان محلوں کے سر بفلک کنگرے اپنے مکین کے فراق ابدی پر آٹھ آٹھ آنسو رو رہے ہیں، سدا بہار اور رنگ برنگ کے پھول جن کی خوشبو آسمان تک اُڑتی تھی پامال ہو گئے اور وہ ہار آور سر سبز ڈالیاں جن پر طائران خوش الحان نغمہ سنجی کرتے تھے۔ اندرا کی بیوگی کا ماتم کر رہی ہیں آدھی رات کا وقت ہے اور اندرا صرف ایک قمقمہ کی روشنی میں سر پر ہاتھ رکھے بیٹھی ہے۔ راجہ کا صدمہ اسکے دل سے زائل ہو چکا، مگر خواب کی صورت وہ مستقل لگن ہے۔ جو کسی طرح فراموش نہیں ہو سکتی، کلیجہ میں ہوک اُٹھتی دِل میں نشتر چبھتے، حلق پر چھریاں چلتیں۔ مگر رات کسی طرح ختم نہیں ہوتی۔ دِل بہت زیادہ تڑپتا تو اُٹھ بیٹھتی۔ ٹہلتی پھرتی، اِدھر جاتی اُدھر جاتی، دیوانہ وار ایک ایک طرف جھانکتی، اور مایوس ہو کر بیٹھ جاتی۔ آسمان تاروں کا تھال لئے اندرا کے سر پر کھڑا تھا، کچھ دیر اس میں محو رہی، اور دفعتہً چلا اُٹھی ❖

جھمکو، جھمکو، آسمانی تارو، اندرا کے سر پر جھمکو، اُڑو، اُڑو، ہوا کے جھونکو، فضائے عالم میں اُڑو، اُڑو اور اندرا کی ہنسی اُڑاؤ، بھیگ بھیگ شب سیاہ! اچھی طرح بھیگ، اور اندرا بدنصیب کو، عرق ناامیدی میں بھگو، آ! آ! صبح قیامت آ! رات کا دامن اور اندرا کا سینہ چاک کر، اُٹھا!

اُٹھا، ظالم آسمان، اپنی کشش سے اندرا کو اُٹھالے، جذب کرلے، غارت کر دے +

(۶)

اثر محبت کی قائل ایک دنیا اور کشش قلب کا معترف ایک عالم سہی، اور کوئی وجہ نہ تھی کہ اندرا جیسی رانی جس نے دعوائے عشق میں راجہ جیسے عاشقِ زار کو قربان کیا، کامیاب نہ ہوتی، اندرا عشقِ زلیخا کی سچی مثال تھی جس طرح ثابت قدمی نے زلیخا کو یوسف کے گلے لگا دیا، یقیناً اندرا اس محبوب کی محبوب ہوتی جس کو خواب میں دل دے بیٹھی۔ مگر اس کا کیا علاج کہ وہ خود گو صورت سے آشنا تھی۔ مگر نام و نشان سے مطلق بے خبر +

ایک زمانہ اسی طرح گذرا۔ ہوا کے جھکڑ چل چل کر رُکے۔ بادِ صبا سر سرا سر سرا کر بند ہوئی، مینہ کی جھڑیاں برس برس کر تھمیں۔ اور خطرناک طوفان آ آ کر ٹلے۔ مگر نہ تھما تو اندرا کی آنکھ کا آنسو جس کو دنیا اندھیرا اور شاہی محل مٹی کے ڈھیر تھے۔ رات کے سنسان وقت میں سر پر بجلی اور طوفان آنکھ کے سامنے جنگل اور بیابان، اندھیر گھپ، در و دیوار چپ، پتے بیہوش چڑیاں خاموش، اور اندرا بدنصیب، یادِ حبیب میں سرشار مضطرب و بیقرار پھر رہی ہے، ایک رات تن تنہا، کنہیا کے خطرناک جنگل میں تھی۔ کہ نیند نے غلبہ کیا، زمین نے میزبانی میں فرشِ خاکی بچھایا۔ دریا کے پانی نے ترانے سنائے، ہوا نے لوری دی۔ اور کنہیا کی مہمان، اسی خارستان میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔ لیٹنا تھا کہ آنکھ لگی اور آنکھ کا لگنا تھا کہ ایک اور ہی سماں آنکھ کے سامنے تھا،

ملک نیا، لوگ انوکھے، صورتیں عجیب، پوشاک نرالی۔ وقت رات

کا ہے۔ مگر اندرا آج چودھویں کے چاند کو مات کر رہی ہے۔ سر پر کار چوبی دوشالہ، گلے میں جواہر نگار مالا۔ گلاب کا پھول ہاتھ میں۔ سات سہیلیاں ساتھ میں، ایک عالم کے دلوں کو پامال کرتی چلی جا رہی ہے۔ چلتے چلتے ایک ایسے مقام پر پہنچی۔ جہاں کی رات پر دن صدقہ ہو رہا تھا۔ جشن شاہی کی تیاریاں تھیں۔ اور ہزارہا بندگانِ خدا مسلح کھڑے تھے، اندرا کا پہنچنا تھا۔ کہ خلقت جشن وجلوس سب بھول گئی۔ ایک چشم زدن میں کئی لاکھ نگاہوں نے اسکی سلامی ادا کی۔ سینکڑوں دل پامال کرتی ہوئی اندرا قصر شاہی میں پہنچی، دیکھتی کیا ہے کہ ولی عہد سلطنت کے دائیں ہاتھ پر وہ چاند چمک رہا ہے، جس کی عاشق زار تھی، دل بے اختیار ہو گیا، صبر کی دھجیاں اڑنے لگیں قریب تھا کہ دوڑ کر لپٹ جائے، شرم وحیا پاؤں پکڑے کھڑی ہو گئی، مگر ششدر، نگاہ اُس چہرہ پر تھی، جس کی تلاش میں جنگلوں کی خاک چھانی، اور جام محبّت سے لبریز دل چھلکنے والا تھا، کہ بادشاہ اور ولی عہد مہمان اور میزبان ایک ایک کر کے رخصت ہوئے ✦

اب اِس عالی شان محل میں اندرا اور مقصود کے سوا کوئی نہ تھا، محبّت بھری نظریں ایک دوسرے کے چہرہ پر پڑ رہی تھیں، دلوں کی کشش نے زور کیا اور اندرا کی آہ رسا تاثیر لائی، چند ہی قدم آگے بڑھی تھی کہ مقصود فرطِ محبّت میں لپکا، گو ولی عہد کا لڑکا تھا، اور نہیں جانتا تھا، کہ اندرا بھی مہارانی ہے۔ مگر رعب حُسن تھا یا داب شاہی محبّت کی زنجیر پاؤں میں آپڑی، بڑھا اور ہاتھ پکڑ لیا ✦

اندرا - اس مہمان نوازی کا شکریہ قبول فرمائیے ✦

مقصود - پیاری، میرا منہ نہیں کہ آپ کی تکلیف کا شکریہ ادا کر سکوں،

آیئے آیئے اِس تخت پر آرام فرمایئے +

اندرا۔ مَیں خاک کی رہنے والی تخت شاہی کی قدر کیا جانوں، یہ خدا آپ کو نصیب کرے +

مقصود۔ خدارا مجھ پر ظلم نہ کیجئے، میرے پاس نہیں تو دور ہی سہی، لیکن! انصاف اجازت دے تو قلب مضطرب پر ہاتھ رکھ کر اتنا دیکھ لیجئے، کہ یہ حُسنِ خداداد مجھ پر کیا اثر کر گیا +

خوشا نصیب، اس مجھ جیسے انسان کے جو اِس صورت کا پرستار اور اِس نازک دل کا مختار ہو +

اندرا کچھ جواب دینا چاہتی تھی کہ بُلبل نے کنہیا کے جنگل میں صبح کا پیغام سُنا دیا، آنکھ کھلی تو کچھ بھی نہ تھا +

(۷)

چاند؟ نہیں! پری؟ نہیں نہیں! حور؟ ہرگز نہیں اندرا ایک پھُول تھی کیسا پھُول؟ جس نے تمام دنیا کو مہکا دیا! جس کی خوشبو پورب سے پچھم اور اُتر سے دکن تک پہنچی، جس کی خوبصورتی کا شہرہ جس کے حُسن کی دھاک ایک عالم میں پھیلی +

آفتاب کو نکلنے مشکل سے دو گھڑیاں ہوئی ہونگی، کہ قبیلہ لنگوہی کا مشہور سردار صبح شام ایک کرتا ہُوا شاہ جہان آباد پہنچا۔ اور جمنا کے کنارے ڈیرے ڈال دیئے۔ کیسی کیسی مشاطائیں جو آسمان میں تھگلی لگائیں۔ زر و جواہر لٹا کر مہیا کیں۔ کہا جو کچھ کہہ سکتا تھا اور کر ڈالا جو کچھ کر سکتا تھا، لیکن عشق کا وہ طوق جو اندرا کے گلے میں خواب نے ڈالا تھا اُتر نہ سکا، کوئی منّت، کوئی ظلم، کوئی سختی ایسی نہ تھی جس سے کام

نہ لیا ہو، ظالم محبت کے بھیس میں نفس کا بندہ نکلا اور لنگوہی خاندان کی عزت پر ایسا دھبہ لگایا، کہ تاریخ اس کو فراموش نہیں کر سکتی۔ اندرا کے حمایتی چن چن کر پکڑے اور وہ قدیم نمک حلال جو اس کی عزت کے ساتھ جانیں لڑائے ہوئے تھے۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے، دکھا دکھا کر مارا، اور بتا بتا کر پیٹا، مگر واہ ری مہارانی اندرا، استقلال کے پاؤں اپنی جگہ سے نہ ٹلے +

(۸)

زر، زمین، زن، کہتے ہیں، کہ یہ تین چیزیں جھگڑے کی اصل اور فساد کی جڑ ہیں، سچ، جھوٹ خدا جانے، مگر اس میں کلام نہیں کہ اندرا کو اس کا حسن مصیبت ہو گیا، ایک صورت اور سینکڑوں عاشقِ زار، ایک انار اور صد بیمار، کس کس کو آغوش میں لے، اور کہاں کہاں دلداری کرے؟ خدا خدا کر کے راجہ کے قبضہ سے نکلی، سمجھی تھی کہ اب باقی عمر اطمینان سے بسر ہو جائے گی، وصل نہ ہو گا، تو فراق کی سختیاں تو ہوں گی، دکھ بھروں گی، مصیبتیں جھیلوں گی۔ رقیبوں کا کھٹکا اور ان آسمانی بلاؤں کا خوف تو نہ ہو گا، موت آئیگی مر جاؤں گی اور یہ کہتی ہوئی اٹھوں گی ؎

حاصلِ عمر فدائے سرِ یارے کردم
شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

مگر افسوس اس ظالم نے وہ ستم توڑے کہ کلیجہ منہ کو آ گیا،

دوپہر ڈھل چکی تھی، کہ قصائی چاروں طرف قتل عام کرتا ہوا اندرا کے محل میں گھسا۔ بدنصیب رانی کا دل دھکڑ دھکڑ کر رہا تھا، سوچتی تھی کہ اب عصمت کا خدا ہی حافظ ہے۔ مدتوں کے سورما اور وفادار جو حکم پر تیار

اور اشارے پر جان نثار کرنے کو موجود تھے، جانیں قربان کر گئے، کوئی بادشاہ نہیں حاکم نہیں کہ فریاد کروں اور جان بچاؤں۔ چھ ساڑھے چھ برس کا دیور ہے موذی نے اسے کیا چھوڑا ہوگا۔ سبب فساد تو میں ہی ہوں۔ میری وجہ سے نہیں تو میرے سبب سے یہ ہزارہا لاشیں خون میں تڑپ رہی ہیں، اتنا کچھ دیکھ چکی اور کیا کیا دیکھوں گی، بس اس دنیا کو خیرباد کہوں۔ محل کے نیچے جمنا کس آن بان سے بہہ رہی ہے۔ اس کی لہریں گود پھیلا کر مجھے لینگی اور یہی اکڑتا مچلتا پانی اس پیاری صورت تک یہ پیغام پہنچا دیگا، کہ اندرا بدنصیب تجھ پر قربان ہوگئی۔ مگر اتنی دور کیوں جاؤں۔ کانوں کے آویزے، جھنگلیا کی انگوٹھی، سر کا سیس یہ تینوں ہیرے جواب تک حسن کو ترقی دیتے رہے۔ آج زائل کر دینے کو کافی ہیں ✦

ابھی اس خیال کا فیصلہ نہ ہوا تھا۔ کہ قزاق قصر شاہی میں گھس آئے اور قتل عام کر دیا۔ سنگ کی ہیلیاں اور ساتھ کی کھیلیاں آنکھوں کے سامنے لٹیں اور بھروسے کے نمک حلال دیکھتے دیکھتے خون میں نہا گئے۔ بیرحم جلادوں نے اب خاص کمرے کا رخ کیا۔ قدم دھرا تھا۔ کہ اس صورت سے چار آنکھیں ہوئیں۔ جس کا شہرہ ہزاروں کوس کی منزل سے کھینچ کر لایا تھا ✦

ماہ جبیں اندرا، اس وقت میلی کچیلی کرتی، بگڑی سی اوڑھنی اوڑھے تصویر کی طرح کھڑی تھی، مگر یہ موہنی صورت اس حالت میں بھی غضب ڈھا رہی تھی۔ عزیزوں کے خون کے قطروں نے افشاں دے کر پیشانی کو جبین عروس کر رکھا تھا۔ سنگ دل سردار نے ایک آہ سرد بھری "اور ہائے اندرا" کا نعرہ لگا کر بڑھا ✦

قیامت خیز وقت تھا کہ اندر جیسی نازنین کو بچاؤ کی صورت نظر نہ آتی تھی مگر واہ رے حُسن اور مرحبا رُعب حُسن اس موقعہ پر بھی وہ کام دیا کہ تیر و تفنگ سب رکھے کے رکھے رہ گئے، اندرا کا اتنا کہنا ایک بجلی تھی کہ ظالم دل پر اِس طرح گری کہ جلا کر خاک کر دیا،

"آیئے آیئے، اور اس سنسان محل کو رونق دیجئے۔"

اندرا جیسی دلربا کے لب لعلیں سے یہ الفاظ ایک جادو تھا کہ سردار کے اوپر پورا کارگر ہُوا۔ اس کی صورت اور اپنی قسمت کا مقابلہ کرتا تھا، دِل خوشی کے مارے ہاتھوں اچھل رہا تھا۔ اتنا کہہ کر پاؤں پر گر پڑا۔

بیگم نے بہت روز تک مصیبت بھگتی۔ اب کچھ دن جوانی کے لطف دیکھو!

اندرا۔ (پاؤں سے سر اُٹھا کر) آپ ایک قبیلہ کے سردار اور ایک ملک کے حاکم ہیں۔ سینکڑوں ہزاروں لاکھوں رعیت آپ کے پاؤں پر سر رکھتی ہے۔ سر اُٹھایئے اور میری عزّت افزائی کیجئے۔

سردار۔ بیگم! کامل تین سال سے اس صورت کی شہرت نے دِل تڑپا رکھا تھا۔ آج دیکھنی نصیب ہوئی۔ کیا میری تقدیر اس قابل ہے کہ آپ میرے ہمراہ میرے قیام گاہ پر تشریف لے چلیں۔

اندرا۔ یہ گھر بھی آپ کا اور وہ گھر بھی، مجھے لے چلئے یا خود تشریف لایئے بہتر ہوگا کہ مہمان نوازی کی عزّت مَیں حاصل کروں اور اجازت دیجئے کہ شام تک اس جھونپڑی کو آپ کے قابل بنانے کی کوشش کروں،

سردار۔ بیگم میں محل اور عزّت کا طلب گار نہیں۔ صرف اس صورت کا

بھوکا ہوں۔ جس نے مجھ کو دیوانہ کر دیا۔ تعمیل میں عذر نہیں، جاتا ہوں شام کو حاضر ہوں گا۔

خدا کی شان جس زمین پر تمام دن خون کے دریا بہتے رہے۔ وہ رات کو نمونہ جنّت بن گئی۔ اندرا کہنے کو تو عورت تھی۔ مگر مردوں سے زیادہ کام کر گئی۔ اور اس حال میں کہ نوکر چاکر عزیز و اقارب سب لقمۂ اجل ہو چکے تھے۔ اس افراتفری اور غدر کے موقعہ پر چٹکی بجاتے میں محل دو محلے سجا لئے۔ آرام گاہ امر واقعی یہ ہے کہ جنّت کو مات کر رہی تھی۔ طلائی مسہری۔ گنگا جمنی پردے۔ سنہری ڈوریاں۔ روپہلی تکیے۔ موتیا کے گجرے۔ چنبیلی کے گنٹھے۔ المختصر سردار لنگوہی کی آنکھیں بھی رانی اندرا کا ٹھاٹھ دیکھ کر کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس سامان پر طرہ اندرا کا اپنا دھانی لباس تھا ؎

کہے تو کہ شب چاند نے آن کے
نکالا ہے مُنہ کھیت سے دھان کے

سردار صورت دیکھتے ہی بے قرار ہو گیا۔ سامان مے ناب موجود تھا اندرا کے نازک ہاتھوں نے مہمان نوازی کی۔

رات آدھی کے قریب گزر چکی تھی۔ کہ ظالم سردار کے دست شوق آگے بڑھے اور ماہ جبیں اندرا کو پہلو میں کھینچا۔

تعجّب ہوتا تھا کہ کس طرح قول کی پکّی۔ بات کی پوری۔ دھن کی سچّی اور دل کی اچھی اندرا ماہ جبیں اس ظالم کی مہمان نوازی کر رہی ہے دفعتہً خنجر آبدار نازک ہاتھوں سے باہر نکلا۔ اور چشم زدن میں سفاک سردار کی انتڑیاں باہر نکال کر پھینک دیں۔ اتنی آواز تو سنائی دی۔

"اے ظالم دغا باز اِس صورت پر یہ دہوکا۔

(۹)

حُسن کا ڈنکا تو چاردانگ عالم میں بج ہی چکا تھا۔ اس سے ایک دنیا اندرا کی شجاعت کا لوہا مان گئی۔

اب مجروح دلوں کی اتنی ہمت نہ تھی کہ اظہار محبت بے سوچے سمجھے کر بیٹھتے۔ انداز دلربائی وہی اور موسمِ شباب بہار پر تھا چشم کافر جدھر پڑتی تھی۔ دل کے ٹکڑے اڑا کر اٹھتی تھی۔ ہزاروں شیدا پیدا ہوئے۔ مگر دل کا ارمان دِل ہیں رہا۔ ایک روز شام کے وقت گرمی کے موسم میں نہا دھو کر محل کی تیسری منزل پر کھڑی ہوئی بال سُکھا رہی تھی۔ زلف شبگوں سے رنگ برنگ کے موتی ٹپک رہے تھے۔ کہ ایک زابلستانی مصوّر ادھر سے نکلا۔ اندرا کو علم تک نہ ہُوا۔ اور مصوّر تصویر لے سیستان روانہ ہوگیا۔

یہ تصویر صحیفۂ قدرت کا ایک ورق تھا جس میں صناع حقیقی نے اپنے ہاتھ سے گلکاری کی تھی۔ زلف شب گوں افعی کی طرح لہراتی ہوئی کمر تک پہنچ گئی تھی۔ اور دستِ سیمیں کی تین اُنگلیاں اس سانپ کو کھلا رہی تھیں۔ ایک نیستان و زابلستان کیا تمام فارس لٹو ہو گیا مگر لنگوہی سردار کا انجام سن کر کس کی ہمت تھی کہ ادھر کا رُخ کرتا۔ ہاں وزیر جنگ کا لڑکا نادر الدولہ جان پر کھیل گیا۔ اور دن رات ایک کرتا ہُوا دلّی پہنچا۔ اور کامل تین روز وہ قتل عام کیا کہ آسمان اور زمین دونوں چلا اُٹھے لنگوہی مظالم از سر نو زندہ کر دئے۔

ہم اتنا مان لینے کو تیار ہیں کہ جس وقت زابلستانی شجاع اِن ماہ جبیں کو بارگاہ شاہی میں لائے ہیں۔ اور نادر الدولہ اسکے آغوش میں سر رکھے لیٹا

ہے تو چشم سیاہ سے آنسوؤں کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ مگر یقیناً ہم
زابلستانیوں کے اس دعویٰ کو صحیح نہیں مانتے کہ اندرا ان کے وزیرزادے
کو دل دے بیٹھی۔ مانا کہ ہزار دو ہزار میں ایک دیکھنے دکھانے کے لائق حسین
و شکیل طرحدار و وضعدار سب کچھ تھا۔ مگر اندرا کے دل کو کچھ اور ہی لو لگی ہوئی
تھی۔ یہ آنسو محبت کے نہیں۔ رنج اور صدمے کے تھے۔ جو مقصود کے
فراق میں اندرا کی آنکھ سے نکلے۔ اور وزیرزادے کے رخسار پر گرے۔
واقعات آنکھ کے سامنے ہیں۔ معاملات کی شہادت پر زابلستانی
ہوں یا ہندوستانی، صائب الرائے خود ہی فیصلہ کرلیں۔
نادرالدولہ جب ہر کوشش میں ناکام رہا اور یہ یقین کرلیا کہ مواصلت
کی امید مطلق خبط ہے۔ اندرا خودکشی پر آمادہ ہے تو اسی شخص نے جو عشق
کا مدعی تھا۔ اس کے تاراج کرنے میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا۔ یہ اندرا کی خوش
نصیبی ہے کہ وزیرزادہ عصمت سے ناامید ہو کر زر و جواہر کے پیچھے پڑا۔
اور اندرا غریب کو لوٹ کھسوٹ کر کھک کر کے چلتا ہوا +

(۱۰)

لیلیٰ کا شیدائی مجنوں۔ شیریں کا فدائی فرہاد۔ مگر اندرا کے گھائل ہزاروں
اور لاکھوں ہندو مسلمان عیسائی۔ ہر قوم میں اس کے عاشق اور ہر ملک میں
اس کے طلب گار پیدا ہوئے اور اپنی اپنی جگہ اپنی اپنی کرنی میں کسی نے
کسر نہ کی۔ ان دو ظالموں سے چھٹکارا ہوا تو مرہٹوں نے ڈیرے ڈالے
ایک شقی القلب تو دن دہاڑے گھر میں گھس آیا اور ایسے ڈیرے ڈالے،
کہ نکلنے کا نام ہی نہ لیا۔ نت نئے سوانگ بناتا اور طرح طرح کی چالیں
چلتا۔ کامیابی کی کوشش ہاتھ سے نہ دی۔ ظلم کئے تو وہ حد کے مکاری

کی تو وہ پوری۔ لیکن سچّی محبّت کا گھائل۔ وہ اچھا دل جو اندرا پہلو میں رکھتی تھی۔ کسی طرح نہ پسیجا۔ اور جو جس راستہ آیا۔ اسی راستہ چلتا ہُوا۔

پڑھنے والو! فراق کی سختیاں ختم ہوئیں۔ داستان مصیبت سُن لی۔ شب وصل کے مزے بھی لوٹ لو۔ ۷ دسمبر ۱۹۱۱ء کی صبح ہے۔ اور آج ماہ جبیں اندرا نک سے سک، ہما دھو۔ پہن اوڑھ انتظار یار میں گھڑیاں گن رہی ہے۔ زیور سے لدی پھولوں میں بسی، عطر میں ڈوبی۔ حُسن کی پوٹ جس نے ہزاروں کے دل لوٹ پوٹ کئے۔ جھروکوں میں بیٹھی دریا کے اس پار دیکھ رہی ہے۔ آسمان اس کے استقلال و صداقت پر لطافت کے پھول نچھاور کر رہا ہے۔ قلعہ معلّٰی کے در و دیوار اس کے انتظار میں شریک ہیں اور جمنا اسکی کامیابی پر مبارک باد کے نعرے لگا رہی ہے۔ مشرقی میدانوں سے آفتاب عالمتاب کے بلند ہوتے ہی ثابت قدمی کے مبارک فرشتے آسمان محبت سے نیچے آئے۔ خلوص کی کشتی عصمت کے غلطاں ناخدا سے جھلمل جھلمل کرتی ہاتھ میں تھی۔ اور وفاداری کے پھریرے ارمانوں کی ہوا میں مہک رہے تھے۔

خوش نصیب! سرزمین شاہجہان آباد! ایک اندرا کی بدولت، تیری شان و شوکت کا ڈنکا روئے زمین پر بج گیا۔ کفران نعمت گناہ کبیرہ ہے۔ اسی کا طفیل ہے کہ جمنا کا وہ کنارہ جو ببول کے کانٹوں سے پٹا پڑا تھا۔ آج گلاب کے پھول گود میں لئے کھڑا ہے۔ بیلے جیسے خارستان کوٹلے جیسے بیابان۔ اسی کے صدقہ میں چمنستان ہو گئے۔ شاہجہان آباد اگر تیرے کھنڈر، ان خزانوں سے مالا مال تھے۔ جن کا اب دنیائے ادب میں کال پڑ گیا۔ تو تیرے باغیچے آج ان رنگ برنگ کے پھولوں سے

شاداب ہیں۔ جن کی مہک آسمان تک پہنچ رہی ہے۔ شاہجہان آباد انصاف کی آنکھیں کھول۔ تعصب کی عینک دور کر۔ اور تامل کی نظر سے دیکھ۔ اِسی سہانی صبح کو نورانی فرشتے تیرے اُجڑے ہوئے گلشن میں نازل ہو رہے ہیں۔ دیکھ، دیکھ، شاہجہان آباد کو دیکھ۔ تیری نازوں کی پلی ماہ جبین اندرا کی بارگاہ آج محبت کے فرشتوں کی سجدہ گاہ ہے۔ دونوں فرشتے جھک گئے۔ آگے بڑھے اور اپنے ہاتھ سے اندرا کو دلہن بنایا۔

(۱۱)

۷ دسمبر ۱۹۱۱ء کو ٹھیک گیارہ بجے جس وقت شہنشاہ معظم نے سلیم گڑھ سٹیشن سے اُتر کر قلعۂ معلیٰ میں قدم رکھا۔ دلی کی سرزمین خوشی کے مارے اچھل پڑی۔ اور یہ آواز سنائی دی،

"میں اندرا نہیں" "اندر پرستھ" "اندر پرستھ" نہیں۔ شاہ جہان آباد" "شاہ جہان آباد" نہیں دلی ہوں۔ وہ جوگی راجہ یدھشٹر لنگوہی کا سردار تیمور وزیر زادہ نادر اور مرہٹہ سیواجی تھا۔ جنہوں نے مجھے لوٹ مار کر برباد کیا اور آج یہ مبارک قدم میرے محبوب کے ہیں جس کو خواب میں دیکھا تھا۔

آج میرا مطلوب ایک عظیم الشان سلطنت کا شہنشاہ ہے۔ قدم میرے سر اور آنکھوں پر۔ میں اندرا نہیں اندر پرستھ ہوں۔

"خدا میرے شہنشاہ کی عمر دراز کرے"

ضعیفہ اور اُسکا بیٹا

(مترجمہ تصدق حسین رضی خالد بٹالوی)

اکثر دیکھنے والوں نے اتوار کے دن انگریزی مناظر کے کامل مجہول سکوت کا نظارہ کیا ہو گا۔ چکی کی سرسراہٹ، خرمن کوب کی مسلسل اور علی التواتر ضربیں، لوہار کے ہتھوڑے کا شور، شبانزادوں کے نغمے، کسانوں کی سیٹیاں، چھکڑوں کی گڑگڑاہٹ، اور دیہاتی دنیا کی تمام آوازیں خاموشی سے بدل جاتی ہیں زمینداروں کے کتے بھی معمول سے کم بھونکتے ہیں۔ کیونکہ آنے جانے والے مسافروں کے آرام میں کم خلل انداز ہوتے ہیں۔ ان مواقع پر میں نے اکثر ہواؤں کو ایک دلنشیں سکوت میں غرق ہوتے اور خوشگوار مناظر کو جن کی مسرت خیز سرسبزیاں ایک ملکی ارغوانی تاریکی میں پھیلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ مقدس خاموشی میں نہاتے ہوئے خیال کیا ہے۔

مشیت ایزدی کا کیا ہی اچھا اصول ہے۔ کہ عبادت کا دن آرام کا دن بھی ہو۔ وہ مقدس استراحت جو قدرت کے چہرہ پر حکومت کرتی ہے۔ اپنا اخلاقی اثر رکھتی ہے۔ ہر مضطرب جذبہ مسحور ہو جاتا ہے۔ اور ہم روح کے فطری مذہب کو اپنے دل کی گہرائیوں سے باہر کی طرف نکلتا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ اگر مجھ سے پوچھا جائے تو گاؤں کے گرجا میں قدرت کی پرحسن متانت کے درمیان ہیں۔ ان احساسات کا تجربہ کیا ہوں جنہیں اور کسی جگہ نہیں پایا۔ اور اگر زیادہ دیندار نہیں۔ تو

میں اپنے تئیں اتوار کو ہفتہ کے دوسرے دنوں سے بہتر خیال کرتا ہوں۔

پچھلے دنوں جب میں مضافات بلدیہ میں اقامت پذیر تھا۔ تو اکثر گاؤں کے قدیم گرجا کو جایا کرتا تھا۔ اس کے تاریک کونے۔ اسکی گرتی ہوئی یادگاریں۔ اس کی سیاہ چوبی مینا کاریاں، تمام کے تمام گذرے ہوئے سالوں کی تاریکیوں سے احترام خیز۔ اسے پرمتانت تفکرات کے لئے ایک موزوں جگہ بنائے ہے تھے۔ لیکن چونکہ یہ ایک متمول آبادی کے قریب واقع تھا۔ اِس لئے فیشن کی جلوہ پاشیاں اس عبادت گاہ میں بھی اثر ریز تھیں اور میں پس وپیش کے "غریب کیڑوں" (سفلی دنیا) میں پھینکا ہوا محسوس کرتا تھا۔ وہ واحد ہستی جو اس جماعت میں ایک سچے عیسائی کے عاجزانہ اور منکسرانہ تقدس کا مجسمہ نظر آتی تھی۔ ایک غریب نادار ضعیفہ تھی۔ جو اپنی کبرسنی اور کمزوریوں کے بوجھ کے نیچے جھکی جارہی تھی۔ اس کی صورت سے حضیض عسرت سے کسی بہتر شے کے نشانات ہویدا تھے۔ اور اسکے چہرہ سے دلپذیر خودداری کے آثار نظر آتے تھے۔ اسکا لباس نہایت معمولی لیکن خاص طور پر صاف اور اجلا تھا۔ اس کی کچھ کچھ عزت بھی کی جاتی تھی۔ کیوں کہ وہ گاؤں کے افلاس زدہ طبقہ کے ساتھ نہیں۔ بلکہ سب سے الگ اسٹیج کی سیڑھیوں پر اکیلی بیٹھا کرتی تھی۔ ایسا نظر آتا تھا کہ اس نے تمام محبت۔ تمام دوستی اور تمام سوسائٹی سے زیادہ عمر پائی ہے۔ اور اس کے پاس آسمان کی امیدوں کے سوا اور کچھ نہیں رہا۔ جب میں نے اسے عبادت میں تخیفانہ اٹھتے۔ اپنے معمر جسم کو جھکاتے۔

اور انجیل پر ایک پریشان نظر ڈالتے ہوئے دیکھا۔ جسے اس کے لرزتے ہوئے ہاتھ اور ناکام آنکھیں پڑھنے کی اجازت نہیں دیتی تھیں۔ لیکن جسے وہ زبانی جانتی تھی۔ تو میں نے خیال کیا کہ اس غریب ضعیفہ کی لرزتی ہوئی آواز۔ پادری کی دعاؤں۔ ارگن کی موسیقی اور بھجن منڈلی کے ترنم زا نغموں سے کہیں پہلے آسمان پر پہنچتی ہوگی۔

میں گاؤں کے گرجاؤں میں پھرتے رہنے کا مشتاق ہوں۔ اور یہ تو ایسی دلفریب جگہ واقع تھا کہ اس کی کشش مجھے اکثر کشاں کشاں اپنی طرف لے جاتی تھی۔ یہ ایک ٹیلہ پر واقع تھا۔ جسکے گرد ایک چھوٹی سی ندی۔ ایک خوبصورت موڑ بناکر قریب کے وسیع مرغزار میں جہاں ہلکی ہلکی گھاس اُگ رہی تھی۔ سانپ کی طرح چکر لگاتی ہوئی دور تک نکل گئی تھی۔ گرجا کے ارد گرد دیودار کے درخت اُگے تھے۔ جو اسکی شان دلپذیری کو کچھ اور بڑھا رہے تھے۔ اسکا بلند مینار جس کے گرد کوّے اور چیلیں منڈلاتی رہتی تھیں۔ ان سے تھوڑا بلند چلا گیا تھا۔ میں ایک دن صبح کی خاموشی میں جب کہ سورج کی روشن شعاعیں حسن قدرت کی زیبائش میں مصروف کار تھیں۔ وہاں بیٹھا دو مزدوروں کو ایک قبر کھودتے دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے قبرستان کا ایک دور افتادہ متروک کونہ چُنا تھا۔ جہاں کی متعدد بے کتبہ قبروں سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہاں نادار اور مفلس لوگ زمین میں دھکیل دیے جاتے ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ نو تیار کردہ قبر ایک بیوہ کے اکلوتے بیٹے

کی ہے۔ ابھی ہیں دنیاوی اعزاز کے ان امتیازات پر جن کا سلسلہ مٹی کے نیچے تک پھیلا ہوا ہے غور کر رہا تھا۔ کہ گھنٹے کی آواز نے جنازہ کے پہنچنے کی خبر دی۔ یہ عسرت کی تجہیز و تکفین بھی جس کے ساتھ تعلی یا نمود کو کوئی تعلق نہ تھا۔ ایک نہایت ہی معمولی تابوت تھا۔ جسے گاؤں کے چند لوگ اٹھائے لا رہے تھے۔ جس پر نہ تو کوئی تابوت پوش تھا۔ اور نہ ڈھکنے ہی کے لئے کوئی اور کپڑا۔ پادری اور سرد مہری اور بے توجہی کے عالم میں ادھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ یہاں نمائشی غم کے جُبوں میں ملبوس کوئی مصنوعی نوحہ گر نظر نہ آتا تھا۔ البتہ ایک حقیقی نوحہ گر تھا۔ جو میت کے پیچھے آہستہ آہستہ لڑکھڑاتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ یہ متوفی کی معمر والدہ تھی۔ وہی غریب ضعیفہ جسے میں نے گرجا میں اسٹیج کی سیڑھیوں پر بیٹھے دیکھا تھا۔ ایک نادار دوست اُسے تھامے ہوئے تھا۔ اور اسے تشفی دینے کی کوششیں کر رہا تھا۔ پڑوس کے چند غریب لوگ ساتھ ہو لئے تھے۔ اور گاؤں کے چند لڑکے ہاتھ میں ہاتھ دیئے دوڑتے پھرتے تھے۔ جو کبھی ایک نامعلوم خوشی سے شور مچا دیتے تھے۔ اور کبھی طفلانہ حیرت میں نوحہ گر کی افسردگی کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگتے تھے۔

جب جنازہ قبر تک پہنچ گیا۔ تو پادری اپنے کلرک کے ہمراہ اپنا جُبہ زیب تن کئے انجیل ہاتھ میں لئے گرجا سے باہر نکلا۔ نماز جنازہ محض ایک خیرات کا کام تھا۔ متوفی قلاش تھا۔ اور پس ماندہ نادار، اس لئے نماز ظاہرہ پوری تو کی گئی۔ لیکن نہایت سرد مہری اور بے حسی سے "خیرات پروردہ" پادری گرجا کے دروازہ سے چند ہی

قدم آگے بڑھا۔ شاید ہی اس کی آواز قبر تک سنائی دیتی ہو گی میں نے نماز جنازہ کی شاندار اور رقت ریز رسم کو الفاظ کی اس برودت خیز نقل میں کبھی تبدیل نہ ہوتے دیکھا تھا۔

میں قبر کے قریب گیا۔ تابوت زمین پر دھرا تھا۔ اس پر متوفی کا نام اور عمر کندہ تھی۔ جارج سامرز۔ عمر ۲۶ سال۔ غریب ماں کو اس کے سرہانے گھٹنوں کے بل بیٹھنے کی مدد دی گئی۔ اس کے ہاتھ جن پر جھریاں پڑ رہی تھیں۔ ملے ہوئے تھے۔ گویا وہ دعا کر رہی تھی۔ لیکن اس کے جسم کی نحیف لرزش اور اسکے ہونٹوں کی رعشہ دار جنبش میں سے دیکھ سکتا تھا۔ کہ وہ اپنے بیٹے کے آخری نشان کو ایک ماں کے دل کی خواہشات سے دیکھ رہی ہے۔

تابوت کو زمین کے سپرد کرنے کی تیاریاں کی گئیں۔ وہ ہلچل جو یاس اور محبت کے جذبات کے لئے گرفتگی کا دل شکن سامان ہوتی ہے محسوس ہونی شروع ہوئی۔ وہ ہدایتیں جو کاروباری لہجہ میں دی گئیں۔ اور بیلچوں کے ریت اور کنکروں پر لگنے کی آوازیں جو ان کے احباب کی قبروں پر جن سے ہم محبت کرتے ہیں۔ تمام آوازوں سے مایوس کن معلوم ہوتی ہیں۔ سنائی دینے لگیں۔ ارد گرد کے اس شور نے اس ضعیفہ کو ایک بدبخت خواب سے چونکا دیا۔ اس نے اپنی چمکدار آنکھیں اٹھائیں اور اپنے گرد ایک کمزور وحشت خیز نظر سے دیکھا۔ جب لوگ تابوت کو قبر میں نیچا کرنے کے لئے نزدیک آئے تو اس نے اپنے ہاتھ ملے اور انتہائے غم سے بے تاب ہو گئی۔ اس غریب عورت نے جو اس کے ساتھ تھی

اس کے بازو کو تھاما۔ اور اُسے زمین سے اٹھانے کی کوشش کی۔ اور اُس کی تسلی کے لئے اُسے کہا۔ نہیں، اب نہیں، اب اس کا دل میں اس قدر فکر مت کرو۔ لیکن اس آدمی کی طرح جسے تشفی کی خواہش نہیں ہوتی۔ وہ بیا تو اب صرف اپنا سر ہلا سکتی تھی۔ یا بار بار اپنے ہاتھ مل کر رہ جاتی تھی۔ جب انہوں نے جسم کو زمین میں اُتارا۔ تو رسیوں کی رگڑ کی آواز نے ایسا معلوم ہوا۔ کہ اس پر نزع کا عالم طاری کر دیا۔ لیکن جب اتفاقاً کسی رکاوٹ سے تابوت کھڑکھڑایا۔ تو ماں کی نزاکت حسیات پاش پاش ہو گئی۔ گویا اسے کوئی تکلیف پہنچ گئی ہے۔ جو دنیا کی تکالیف کی دسترس سے باہر تھا۔

میں زیادہ نہ دیکھ سکتا تھا۔ میرا کلیجہ منہ کو آ گیا۔ میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ میں نے محسوس کیا کہ مادرانہ رقت کے اس درد انگیز منظر کو اس طرح دیکھنا بربریت کی انتہا ہے۔ میں قبرستان کے ایک اور حصہ کی طرف چلا گیا۔ جہاں میں اہلِ جنازہ کے منتشر ہونے تک بیٹھا رہا۔

جب میں نے ماں کو آہستہ آہستہ لیکن شدتِ درد سے قبر سے اُٹھتے دنیا میں اپنی تمام محبتوں کے عزیز ترین نشان کو ہمیشہ کے لئے اپنے پیچھے چھوڑتے اور خاموشی و ناداری کی طرف واپس لوٹتے دیکھا تو میرا دل بھر آیا۔ میں نے خیال کیا کہ امیروں کو کیا تکلیفیں ہیں۔ ان کی تشفی کے لئے دوست ہیں۔ وقت گذاری کے لئے مسرت کے سامان۔ اور غم غلط کرنے کیلئے ایک دنیا۔ نوجوانوں کے کیا غم ہیں! ان کے بڑھتے ہوئے دل جلد زخموں کو بھر دیتے ہیں۔ ان کی لچکدار طبیعتیں جلد دباؤ کے نیچے سے اٹھتی ہیں۔ ان کی تازہ اور زود تاثیر محبتیں نئی چیزوں کے گرد لپٹ جاتی ہیں۔ لیکن غریبوں کے غم جن کی تشفی کے لئے کافی ذرائع نہیں۔ بوڑھوں کے غم [illegible]

نزدیک حیاتِ انسانی کا بہترین منظر موسمِ سرما کا ایک دن ہوتا ہے۔ اور جنہیں اپنی باقی ماندہ زندگی میں پھر نمود مسرت کی کوئی امید نہیں۔ ایک بیوہ کے غم جو ضعیف ہے اور تن تنہا ہے۔ نادار ہے اور اپنے اکلوتے بیٹے کی لاش پر جو اس کے گذرے ہوئے سالوں کی تاریکیوں میں امید کی آخری شعاع تھا۔ ماتم کناں ہے۔ یہ ہیں۔ یقیناً وہ غم جو ہمیں تسلی و تشفی کی ضرورت محسوس کراتے ہیں۔ اس سے تھوڑی دیر بعد میں قبرستان سے پلٹا۔ راستہ میں مجھے وہ عورت ملی۔ جو ضعیفہ کو تشفی دینے میں کوشاں تھی۔ اور اب اسے اس کے ویران غمکدہ میں چھوڑ کر واپس آ رہی تھی۔ میں نے اس سے اس رقت انگیز منظر کے متعلق جو میں نے دیکھا تھا، چند باتیں پوچھیں۔

متوفی کے والدین گاؤں میں بچپن سے رہتے تھے۔ وہ گاؤں کی ایک قریب ترین جھونپڑی میں آباد تھے۔ اور مختلف دیہاتی کاموں اور ایک مختصر سے باغیچہ کی آمدنی سے جو ان کی ملکیت تھا۔ اچھی طرح فارغ البالی سے اپنا گذارہ کرتے۔ اور ایک مسرور اور بے لذت زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کا ایک لڑکا تھا جو ان کے بڑھاپے کا عصا اور ان کی ساحرہ تخیلوں کا سامان تھا۔ "آہ جناب"۔ اس عورت نے کہا۔ میں کیا کہوں کہ وہ کس قدر خوبصورت اور وجیہہ، کس قدر خوش مزاج ۔ بشاش۔ ہر چھوٹے بڑے پر کس قدر مہربان اور اپنے والدین کا کس قدر فرماں بردار تھا! اتوار کے دن جب وہ اپنے بہترین لباس میں ملبوس تھا۔ بایں ہمہ وجاہت و بشاشت اپنی ماں کو سہارا دیئے گرجا جاتا تھا۔ کیوں کہ وہ کسی اور آدمی کی بجائے جارج کے بازو پر جھکنے کی زیادہ مشتاق تھی۔ اور وہ غریب روح اس پر بجا طور پر نازاں تھی کیونکہ ارد گرد کے تمام مضافات میں اس سے زیادہ خوبصورت یا وجیہہ کوئی

نہیں تھا۔ تو ہر ایک کا دل اس کو دیکھ کر اپنے تئیں پہلے سے بہتر محسوس کرتا تھا۔

بدقسمتی سے ایک سال قحط اور عام زراعتی تکالیف کو مدنظر رکھتے ہوئے لڑکا قریب کے ایک دریا پر کسی کام میں ملازم ہونے پر مجبور ہو گیا۔ ابھی ملازم ہوئے دیر نہ ہوئی تھی۔ کہ بحری ڈاکوؤں کا ایک گروہ اسے پھنسا کر سمندر پار لے گیا۔ اسکے والدین نے اس کے پکڑے جانے کی خبر سنی۔ لیکن اس سے زیادہ خبر نہ آئی۔ اور پتہ نہ ملا۔ یہ ان کے اس واحد مایۂ ناز کا نقصان تھا جس کی تلافی معلوم! باپ جو پہلے ہی نحیف و زار تھا۔ مایوس اور افسردہ ہو گیا۔ اور جلد قبر میں جا گرا۔ ضعیفہ جو اس عمر اور کمزوری میں اکیلی رہ کر اپنا گذارہ نہ کر سکتی تھی۔ خیرات خانہ میں چلی گئی۔ اب بھی تمام گاؤں میں اس کی طرف شفقت کی نگاہیں اٹھتی تھیں۔ اور سب اس کی عمر کو مدنظر رکھتے ہوئے اسکے لیے خاص احترام ملحوظ رکھتے تھے۔ کیوں کہ اس جھونپڑی میں جہاں اس نے بہت سے دن خوشی میں بسر کیے تھے کسی نے درخواست نہ دی۔ اسے وہاں رہنے کی اجازت دی گئی۔ اب وہ وہاں نہایت افسردگی۔ تنہائی اور ناداری سے اپنی زندگی کے دن پورے کرتی تھی اس کے مختصر باغیچہ کی قلیل پیداوار اس کی محدود ضروریات کو پورا کر دیتی تھی۔ جس میں اس کے پڑوسی کبھی کبھی ہل وغیرہ چلا دیتے تھے۔ جس دن مجھے یہ یہ واقعات بتائے گئے۔ اس سے چند دن پہلے کا ذکر ہے۔ کہ وہ اپنے کھانے کے لیے کچھ ترکاری چن رہی تھی۔ جب اس نے جھونپڑی کے اس دروازہ کو جو باغیچہ کی طرف تھا۔ کھلتے دیکھا۔ ایک اجنبی باہر آیا۔ جو نہایت سراسیمگی اور وحشت سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ وہ بحری کپڑے پہنے تھا

نہایت منحنی الجسم اور خطرناک طور پر زرد تھا۔ اور ایسا نظر آتا تھا جیسے کوئی بیماریوں اور تکلیفوں سے چور ہوچکا ہے۔ اُس نے ضعیفہ کو دیکھا اور اسکی طرف جلدی سے بڑھا۔ لیکن اس کے قدم کمزور تھے۔ وہ اسکے سامنے اپنے گھٹنوں پر گر پڑا۔ اور ایک بچہ کی طرح رونے لگا۔ غریب عورت اِس پر ایک خالی اور آوارہ آنکھ سے ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگی "آہ میری پیاری۔ میری پیاری ماں۔ کیا تم اپنے بچے کو نہیں جانتی ہو؟ تمہارا غریب لڑکا جارج؟" یقیناً یہ اس کے شاندار اور وجیہہ بچے کا ڈھیر تھا جو بیماریوں تکلیفوں اور دشمن کی قید سے چور چور ہوکر آخر کار اپنے برباد شدہ اعضا کو گھر کھینچ لایا تھا۔ تاکہ اپنے بچپن کے منظروں میں آرام کرے۔

میں ایسی ملاقات کے واقعات کو جہاں غم اور خوشی اِس کامل طور پر ہم آغوش ہوں۔ تفصیلاً بیان کرنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ وہ ابھی تک زندہ تھا۔ وہ اپنے گھر آگیا تھا۔ شاید وہ اس کی ادھیڑ عمر کو آرام اور تسلی دینے کے لئے زندہ رہے۔ لیکن قدرت طاقت اِس میں ختم ہوچکی تھی۔ اور اگر اسکی قسمت کے کام کو تکمیل دینے کے لئے کسی چیز کی کمی تھی۔ تو اس کی جھونپڑی کی بربادی اس کے لئے کافی تھی۔ وہ اس شکستہ چارپائی پر جہاں اس کی ماں نے بہت سی راتیں آنکھوں میں گذاری تھیں۔ دراز ہوگیا اور وہاں سے پھر کبھی نہ اٹھا۔

گاؤں والوں نے جب سنا۔ کہ جارج سامرز واپس آگیا ہے۔ تو سب اکٹھے ہوکر اسے دیکھنے کو آئے۔ اور ہر ایک نے اس کے آرام کے لئے مقدور بھر مدد دینی چاہی۔ لیکن وہ اِس قدر کمزور تھا۔ کہ بول نہ سکتا تھا اس کی ماں اس کی دائمی خدمت گار تھی۔ اور وہ بھی کسی دوسرے ہاتھ

کی مدد لینا پسند نہ کرتا تھا۔

بیماری میں کچھ ایسی تاثیر ہوتی ہے۔ جو غرورِ جوانی کی تمکنت کو پست کر دیتی ہے۔ جو دل کو نرم کر دیتی ہے اور اس میں بچپن کے احساسات پیدا کر دیتی ہے کون ایسا ہے جسے (خواہ ادھیڑ عمر ہی میں) بیماریوں اور مایوسیوں نے اپنا تختۂ مشق بنایا ہو۔ کون ایسا ہے جو وطن سے دور دیارِ غیر میں ایک تھکا دینے والے بستر پر گھلا کیا ہوا ہو۔ اور اپنی ماں کو یاد نہ کیا ہو۔ جو اس کے بچپن کو دیکھا کرتی تھی۔ جو اس کے سرہانے کو نرم رکھتی تھی۔ اور اس کی بے بسی میں اس کی معاون ہوتی تھی۔ آہ! اس محبت میں جو ماں کے دل میں اپنے بچے کے لئے ہوتی ہے۔ ایک ایسی غیر فانی۔ لیکن اثر پذیر نزاکت ہے۔ جو دل کی باقی تمام محبتوں سے بلند اور رفیع ہے۔ اس کی گرمیوں کو نہ تو خود غرضی سرد کر سکتی ہے اور نہ خطرے ہی اسے ڈرا سکتے ہیں۔ نہ کم شعوری اور نالائقی اسے کمزور کر سکتے ہیں۔ اور گلہ مندانِ بے ادب کا کفرانِ نعمت اسکا گلا گھونٹ سکتا ہے۔ ماں اپنے بچے کے لئے اپنی تمام راحتیں قربان کر دیگی۔ وہ اپنی تمام مسرتیں اس کی خوشی پر نثار کر دے گی۔ وہ اس کی شہرتوں پر فخر کرے گی اور اس کی کامیابیوں پر نازاں ہو گی۔ اگر اس پر تکلیفیں آتی ہیں۔ تو وہ تکلیفیں اسے اس کی نظروں میں عزیز تر کر دیں گی۔ اور اگر اس کے نام پر بدنامیوں اور رسوائیوں کا ہجوم مستولی ہے۔ تو وہ ان بدنامیوں اور رسوائیوں کے باوجود اسے اور بھی چاہے گی۔۔۔ اور بھی زیادہ محبت کرے گی اور اگر ساری دنیا اُسے چھوڑ دے۔ تو وہ اس کے لئے ساری دنیا چھوڑ دیگی۔

غریب جارج سامرز جانتا تھا۔ کہ بیمار پڑنا اور کسی پوچھنے والے کا نہ ہونا۔ قید کی مشقتوں میں اکیلے پڑا سڑنا اور کسی دیکھنے والے کا نہ آنا کیا ہوتا ہے

وہ اپنی ماں کو اپنی نظروں سے اوجھل ہوتے نہ دیکھ سکتا تھا۔ اگر وہ کہیں جاتی۔ تو اسکی نظریں اس کے پیچھے پیچھے جاتیں۔ وہ پہروں اسکی چارپائی کے پاس بیٹھی اُسے سوتے دیکھتی رہتی۔ بعض اوقات وہ بخار کی شدت میں کوئی خواب دیکھ کر چونک اُٹھتا اور بیتاب ہوکر سراسیمہ وار ادھر اُدھر دیکھتا۔ حتٰے کہ اپنی ماں کو اپنے اوپر جھکا ہوا پاتا۔ وہ اسکا ہاتھ پکڑ لیتا۔ اُسے اپنی چھاتی پر رکھتا۔ اور بچے کی نیند سو جاتا۔ اس طرح وہ مر گیا۔

جب میں نے درد و غم کی یہ حسرت خیز کہانی سنی تو میرے دل میں پہلا خیال یہ آیا۔ کہ اس نوحہ گر کی جھونپڑی کی طرف جاؤں۔ اور اس کی کوئی مالی معاونت اور اگر ہوسکے تو اس کے آرام کی کوئی کوشش کروں۔ لیکن دریافت کرنے پر معلوم ہوا۔ کہ گاؤں والوں کے قابل احترام عمدوساست نے جو کچھ ہوسکتا تھا۔ اس کے لئے مہیا کر دیا ہے۔ اور چونکہ غریب باہم اپنا غم غلط کرنا بہتر جانتے ہیں۔ میں نے دخل انداز ہونے کی جسارت نہ کی۔

اگلے اتوار میں پھر اس گرجا کو گیا۔ اور اس ضعیفہ کو ایک کونے سے اپنی جگہ کی طرف لڑکھڑاتے ہوئے آتا دیکھ کر نہایت متعجب ہوا۔ اُس نے کوشش کی تھی۔ کہ ایسا لباس پہنے جس سے اس کے بچے کے ماتم کا افسوس ظاہر ہو۔ اور اس بے لوث محبت اور ضعیف عسرت کی باہمی کشمکش سے زیادہ رقت انگیز منظر کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ ایک یا دو سیاہ ربن۔ ایک پرانا سیاہ رومال۔ اور ایک یا دو اور اسی قسم کی عاجزانہ کوششیں اس غم کو ظاہر کرنے کے لئے کی گئی تھیں جس کو نمود سے کوئی تعلق نہ تھا۔ جب میں ان جبرت افروز منقوش یادگاروں۔ شاندار جگہوں اور بے خلوص تموّل کو دیکھتا تھا۔ جن کے ساتھ "شوکتیں" اپنی گذشتہ تعلیوں پر اظہار غم

کرتی ہیں۔ اور پھر اس نادار ضعیفہ کی طرف متوجہ ہوتا تھا۔ جو اپنے خدا کے سامنے غم اور غم سے جھکی جاتی تھی۔ اور ایک پاکباز اور شکستہ دل سے مصروف عبادت تھی۔ تو میں نے محسوس کیا۔ کہ حقیقی غم کی یہ زندہ یادگار ان سب سے زیادہ باوقعت ہے۔

میں نے اس کی المیہ کہانی وہاں کے چند متمول آدمیوں۔ کے سامنے بیان کی۔ اور وہ اس سے بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے اس کے لئے زیادہ آرام مہیا کرنے اور اس کی تکالیف کو کم کرنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن یہ صرف چند قدموں کو قبر کی طرف زیادہ آسان کرنا تھا۔ ایک دو ہفتوں کے بعد وہ گرجا میں اپنی جگہ پر نہ دیکھی گئی اور اس علاقہ کو چھوڑنے سے قبل مجھے سن کر ایک گونہ تسلی ہوئی۔ کہ اس نے نہایت سکون سے اپنے آخری سانس ختم کئے۔ اور اس دنیا میں جہاں دوست کبھی جدا نہیں ہوتے۔ اپنے ان عزیزوں سے دوبارہ ملنے کے لئے چلی گئی ہے۔ جن سے وہ محبت کرتی تھی۔

دِل کا قصور

(مترجمہ جناب فاخر ہرہانوی بی۔اے)

کزیہ بطخوں کے کچھ انڈے ایک قریبی رشتہ دار کو نذر کرنے کے لئے ہتیبرین فلیٹ کی طرف جا رہی تھی۔

یہ خوبصورت دوشیزہ ایک مالدار کسان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ گھر کے ڈربے سے بطخوں کے جتنے انڈے حاصل ہوتے۔ نوجوان بیٹی کی جائز ملکیت خیال کئے جاتے تھے۔ کزیہ بطخوں کی عاشق زار اور ان کے پالنے میں بہت زیادہ مشہور تھی۔ یہاں تک کہ گرد و نواح کے شوقین مزاج زمیندار اس فن میں اس سے مشورہ لیتے تھے۔

کفایت شعاری دیہات کی لڑکیوں کا خاصہ ہے۔ انہیں جو قلیل رقم والدین سے ملتی ہے۔ وہ اسے خرچ کرنے کی بجائے جوڑتی رہتی ہیں۔ جو کچھ عرصے میں ایک معقول رقم بن جاتی ہے۔ مگر کزیہ اس کلیے سے مستثنےٰ تھی ایک مرفع الحال کسان کی ناز پروردہ بیٹی کے لئے یہ ضروری نہ تھا۔ کہ وہ آئندہ ضرورتوں کے لئے کوڑی کوڑی جمع کرے۔ اُسے جو کچھ والدین سے ملتا ہنس کر لیتی۔ اور آرائش لباس پر صرف کر دیتی۔

آج حسب معمول اس نے زرد آسمانی رنگ کے زین کا خوشنما اور چُست گون پہن رکھا تھا۔ جس پر سفید چھوٹا سا گلوبند شانوں پر عقیدت مندانہ نثار ہو رہا تھا۔ پیرس کی بنی ہوئی خوبصورت ٹوپی جو اس کے چچا زاد بھائی نے اپنی دُکان سے انتخاب کر کے بھیجی تھی اس کے نرم نرم بالوں پر ایسی معلوم ہوتی تھی

جیسے پھولوں کا ایک گلدستہ زمردین فرش پر الٹا پڑا ہو۔

وہ حسین تھی۔ اور قدرتی طور پر اسکے دیکھنے والوں کی ایک جماعت بھی پیدا ہوگئی۔ دیہاتی نوجوان یکے بعد دیگرے بظاہر اسکے باپ کی دقیانوسی کہانیوں سننے لطف اندوز ہونے اور بباطن آنکھوں ہی آنکھوں میں اس پیکرِ جمال کو پیغام محبت پہنچانے اسکے گھر آئے۔ اور واپس چلے گئے۔ کزیہ نے کئی مرتبہ ان قدیم نیازمندوں کو شادی کی درخواست کرتے سنا۔ اور سر ہلا دیا۔ رفتہ رفتہ اتنی مشاق ہوگئی۔ کہ متکلم کی گفتگو سے اسکے دلی جذبات کا فوراً اندازہ کرلیتی اور پیش بندی کے طور پر استہزا و تضحیک کو کام میں لاکر ہر نئے امیدوار کی امیدوں کو قبل از وقت اس طرح مجروح کردیتی کہ اسے دوبارہ عرض نیاز کی جسارت ہی نہ ہوتی۔ سب سے زیادہ مشہور واقعہ وہ ہے۔ جو جون کے ساتھ پیش آیا کزیہ نے اسکا ذکر مطلقاً کسی سے نہیں کیا۔ مگر ناکام عاشق نے ایک دن حالت نشہ میں سارا قصہ من وعن کہہ سنایا۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے جون کو کزیہ سے تنہائی میں بالمشافہ گفتگو کرنے کی سعادت نصیب ہوگئی۔ جون نے اس زرین موقع کو غنیمت سمجھ کر لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں حسرت عشق کی خوش التفاتیوں کا ذکر خیر شروع کردیا۔ کزیہ اس وقت کچھ سہم سی گئی تھی۔ پھر بھی اس نے استقلال کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اور پانی کا بھرا ہوا ڈول نوجوان عاشق کے سر پر انڈیل کر اسکی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

صرف ایک مرتبہ اسکا دل پسیجا تھا۔ ایک ہی مرتبہ جب ریف نے اس سے شادی کی درخواست کی تھی۔ دونوں بچپن میں ہم سبق رہ چکے تھے۔ اور ان پرندوں کی طرح جو اکھٹے ایک گھونسلے میں پیدا ہوتے اور پلتے ہیں۔ مگر بال و پر نکلتے ہی مختلف سمتوں میں پرواز کر جاتے ہیں۔ تعلیم سے فارغ ہوتے

ہی دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔ کزیہ دل ہی دل میں رلیف سے مانوس ہو چکی تھی۔ یہ کیوں؟ وہ خود اس راز سے ناواقف تھی۔ مگر جب اس اکھڑ دیہاتی سے شادی کی درخواست کر دی۔ تو اس نے نہ صرف اسکی درخواست کو ٹھکرا دیا۔ بلکہ اس کے جذبات کی اتنی توہین کی۔ کہ نامراد عاشق ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ اس خاموشی کی ایک نمایاں وجہ رلیف کی ناداری تھی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اندھے دیوتا کا تیر جگر میں پیوست ہو چکا تھا۔ محبّت کی نہ بجھنے والی آگ رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی۔ اگرچہ خود دار عاشق کی خاموش نگاہوں نے اسے ہمیشہ چھپائے رکھا۔

خیر! کزیہ چلتے چلتے شاہراہ کے اس موڑ پر جہاں پھولوں کی جھاڑیاں کثرت سے اُگی ہوئی تھیں رک گئی۔ اور سوچنے لگی۔ کہ اسے کونسا راستہ اختیار کرنا چاہیئے۔ اگر وہ سیدھی سفید سڑک پر سے جائے تو دو میل کی مسافت بڑھ جاتی ہے۔ اگر مختصر راستہ اختیار کرے۔ (جسکا یہ مطلب ہے کہ اسے رلیف کے کھیتوں میں سے ہو کر چونے کی کچی دیواروں پر سے گذرنا ہو گا۔ جہاں راستے میں قدم قدم پر پھسلنے کا اندیشہ ہے) تو وہ منزلِ مقصود پر پاؤ گھنٹے سے بھی کم عرصے میں پہنچ سکتی ہے۔ آخر اس نے فیصلہ کر لیا۔ کہ وہ راستے کی مصیبتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے جلد از جلد منزل مقصود پر پہنچنے کی کوشش کریگی۔

یہ سوچتے ہی اس نے ٹوکری کو اچھی طرح سنبھال لیا اور تنا اور درختوں کی بیچ در بیچ شاخوں کے خلا میں گھس گئی۔ اب وہ نہر کے اس کنارے کے ساتھ ساتھ جا رہی تھی۔ جہاں پھول آبِ رواں میں اپنا عکس دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ جھرنے پر جس جگہ پانی پتھروں کے نیچے سے فوارہ بن کر اچھل رہا تھا۔ وہ اچانک مڑی۔ مڑتے ہی ایک فرسودہ چوبی دروازے کا رُخ

کیا۔ جس کے دوسری طرف گیہوں کے سبز کھیت لہلہا رہے تھے۔ کھیتوں میں سے گذرتی ہوئی چونے کی پہلی بلند دیوار کے سامنے جا پہنچی۔ اِس دیوار کو پھاندنا آسان کام نہ تھا۔ کیونکہ مقابل کی سطح اس کے سر سے بھی اونچی تھی۔ تاہم نوجوانی کا خون اسکی رگوں میں موجزن تھا۔ وہ مطلق ہراسان نہ ہوئی۔ انڈوں کی ٹوکری کو سب سے اونچے پتھر کے ایک محفوظ مقام پر رکھ دیا اور دیوار پر چڑھنا شروع کیا۔ یہ حقیقت میں بہت خطرناک کام تھا نازک دیوار اس کے بوجھ سے کانپ رہی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ دیوار کے سرے پر پہنچ گئی۔ دیوار کے ساتھ ہی اسکا دل سینے میں کانپنے لگا۔ اب ایک چھلانگ میں وہ مرتفع کھیت کی سبز گھاس پر پہنچ چکی تھی۔ مگر ساتھ ہی دیوار کا کچھ حصہ گر کر کھیت کے ساتھ ہموار ہو گیا۔

وہ آہستہ آہستہ زمین پر سے اٹھی۔ خوف کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر شرارت کی خفیف سی سرخی دوڑ گئی۔ پھر زور سے ایک قہقہہ لگا کر کہنے لگی۔

"یہ رلیف کے لئے کافی سزا ہے۔ اگر کسی غیر شخص کی دیوار ہوتی تو شاید میں دوبارہ تعمیر کرا دیتی۔ مگر چونکہ یہ رلیف کا کھیت ہے"

یہ جملہ ابھی ختم نہ ہوا تھا کہ اچانک اس کے منہ سے چیخ نکلی۔ قریب ہی کھیتوں میں ایک سیب کے پھلے پھولے درخت کے نیچے رلیف چاقو سے لکڑی کی میخ درست کر رہا تھا۔ اور ایک خاص انداز سے مسکرا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک نمایاں تھی۔ کزیہ نے جلدی میں ٹوکری سنبھالی (جسے ابتک کوئی نقصان نہ پہنچا تھا) اور بھاگنا شروع کر دیا۔ مگر رلیف نے بھی لمبی لمبی ڈگوں سے تعاقب شروع کر دیا۔ اور بھاری بھرکم آواز میں کہنے لگا۔

"کزیہ! میں نے تمہارا ایک ایک حرف سن لیا ہے۔ یہاں دستور ہے کہ جو شخص دیوار کو گراتا ہے۔ وہی اُسے دوبارہ تعمیر کرتا ہے۔ تمہیں اس کی تعمیل کرنی ہوگی۔"

"وہ مڑی اور تن کر کہنے لگی" ہرگز نہیں۔

ریف "کیوں نہیں۔ تمہیں یہ کام کرنا پڑے گا"

کزیہ کا چہرہ ارغوانی ہوگیا۔ کہنے لگی۔

"ایک طرف ہٹ جاؤ۔ اور مجھے گذر جانے دو"

"یہ ناممکن ہے۔ تم نے بیجا مداخلت کی ہے" پھر ایک بورڈ کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا:۔

وہ دیکھو۔ بیجا مداخلت کرنے والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ اس دیوار کو میرے سامنے ٹھیک کرو"

کزیہ نے مرعوب آواز میں کہا۔

"میں زور سے چیخوں گی۔ اور کوئی خدا کا بندہ میری فریاد سن لیگا"

"چاہے چیختے چیختے تمہارا گلا کیوں نہ بیٹھ جائے۔ کوئی نہیں سننے کا۔ یہ میرا کھیت ہے۔ بس ایک دفعہ کہہ دیا کہ بے چون وچرا کام شروع کردو"

"ریف! تم ایک عورت کی کمزوریوں کا ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے ہو میں اس کام کی عادی نہیں"

ریف نے ایک ملاطفت آمیز نظر کزیہ کے چہرے پر ڈالی اور کہنے لگا۔

کزیہ! تم نے ایک دفعہ میرے جذبات کی توہین کی تھی۔ میں آج تمہارے غرور کو نیچا دکھانا چاہتا ہوں۔ یہ سزا آئندہ تمہیں ایک سبق کا کام دیگی۔ ہاں! سب سے پہلے بڑے بڑے پتھر اٹھاؤ۔

آج کزیہ نے پہلی مرتبہ ریف کے چہرے کا پوری طرح معائنہ کیا جس میں مردانہ وقار کی تمام علامات موجود تھیں۔ اور آج اُسپر پہلی مرتبہ اس امر کا انکشاف ہُوا کہ یہ تندرست اور سڈول جسم کا انسان جس کی کہنیوں تک چڑھی ہوئی قمیص گرمی کے مارے پسینے میں لت پت ہو رہی تھی۔ حقیقت میں ایک نہایت وجیہہ اور خوبصورت انسان ہے۔ اور گاؤں میں اسکی ٹکر کا کوئی آدمی مشکل سے نظر آئے گا۔ جو صحیح معنوں میں مرد کہلانے کا مستحق ہو۔ کزیہ نے جس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اور جس کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک پیدا ہو گئی تھی۔ ایک فوری کیفیت سے متاثر ہو کر زرد دستانوں کو ہاتھوں سے علیحدہ کیا۔ پھر بڑبڑاتے ہوئے کہا:

"میں تم سے متنفر ہوں۔ مگر اب میں نے یہ تہیہ کر لیا ہے۔ کہ اس کام کو سرانجام دوں گی۔ یقیناً یہ محنت مجھے ہلاک کر دے گی۔"

ریف نے زور سے ایک قہقہہ لگایا۔ کہنے لگا:۔

"میں یہ گناہ گردن پر نہیں لے سکتا۔ اچھا آؤ مل کر کام کریں۔ میں تمہیں صرف اتنی رعایت دے سکتا ہوں کہ تم چھوٹے چھوٹے پتھر اٹھاؤ۔ اور بھاری بھاری پتھر میں اٹھاؤں گا۔"

کام شروع ہو گیا۔ ریف نے دیکھا اور دیکھ کر بہت خوش ہُوا کہ کزیہ جو پتھر اٹھا کر لاتی وہ جسامت میں سیب سے بھی چھوٹے تھے۔ اور ایک پھیرے میں پانچ منٹ صرف کر دیتی تھی۔ دونو خاموشی سے کام کرتے رہے۔ یہاں تک کہ دو قطاریں مکمل ہو گئیں۔

آخر ریف کہنے لگا:۔

اِس طرح ہمارا ایک دن صرف ہو جائے گا۔ اب میرے ناشتے کا وقت ہے سامنے درختوں کے سایئے میں کچھ کھانا اور مکھن موجود ہے چلیں اور چلکر ناشتہ کر لیں

کزیہ بولی! اگر گاؤں والوں کے کان میں ذرا بھی بھنک پڑ گئی۔ تو کیا کیا چہ میگوئیاں ہوں گی۔ نہیں نہیں میں اس کی تعمیل سے معذور ہوں۔

ریف نے ایک سخت لہجہ میں کہا:۔

"تمہیں کھانا پڑے گا۔"

سوائے اطاعت کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ روٹی کے نوالے اس کے حلق سے بمشکل نیچے اترتے تھے۔ پانی پتھر کی طرح بھاری ہو گیا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر کزیہ نے کام شروع کرنے کے لئے کہا۔ تو ریف نے مصلحتاً ٹالدیا اور روک کر کہنے لگا:۔

میں کھانے کے بعد تمباکو کا عادی ہوں۔ ذرا دیر میں چلتے ہیں۔ اس اثنا میں ہم گذری ہوئی صحبتوں کی پُر لطف یاد کو تازہ کرینگے۔ (کزیہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر) کزیہ تمہیں یاد ہوگا۔ ایک دفعہ میں نے ایک کبوتر تمہارے لئے شکار کیا تھا۔ جو نیچے گرتے وقت سب سے اونچے درخت کی بالائی شاخوں میں اٹک گیا تھا۔ مگر میں گلہری کی طرح چڑھا اور اُسے تمہارے لئے اتار کر لے آیا۔

کزیہ نے ایسا ظاہر کیا۔ گویا کچھ سنا ہی نہیں۔ وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور دیوار کے سامنے جا کر پھر پتھروں کو جمع کرنا شروع کر دیا۔ مگر کزیہ جس قدر عجلت سے کام لیتی تھی۔ ریف اتنا ہی سُست ہو رہا تھا۔ چار بجے تک صرف نصف دیوار ختم ہو سکی۔ آخر کزیہ نے تھک کر رونا شروع کر دیا۔ ریف اس آواز سے بیتاب ہو گیا۔ اور ملائم آواز میں کہنے لگا:۔

"کزیہ تمہیں کافی سزا مل چکی ہے۔ بس اب باقی ماندہ دیوار میں خود ختم کروں گا۔"

کزیہ پر ان الفاظ کا مطلق کچھ اثر نہ ہوا۔ اس نے اور بھی تیزی سے کام شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر کہ وہ واقعی اسے پورا کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ ریف بھی ہوشیار ہو گیا

اور دیوار دو گھنٹے کے اندر ختم ہو گئی۔

کزیہ نے ٹوکری اٹھائی اور گھر کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ وہ اس دفعہ بالکل خاموش جا رہی تھی۔ اسکا سر آگے کی طرف جھکا ہوا تھا۔ جب کچھ دور نکل گئی۔ تو یکایک ریف کو کچھ خیال آیا۔ اور جسم میں کپکپی پیدا ہو گئی۔ وہ کزیہ کے پیچھے لپکا۔ اور چوبی دروازہ میں پہنچنے سے پیشتر ہی اسے جا لیا۔ پھر ندامت کے لہجے میں کزیہ کے شانوں پر جھک کر کہنے لگا۔

کزیہ میں تم سے معافی کا خواستگار ہوں۔

کزیہ نے ٹوکری زمین پر رکھدی۔ اور اپنے ہاتھ دکھائے۔ انگلیوں سے خون بہ رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر ریف کی آنکھیں بھی پُرآب ہو گئیں۔ اور لجاجت سے کہنے لگا۔

پیاری کزیہ۔ کیا تم مجھے معاف نہ کرو گی۔

غم کے بادل کزیہ کے چہرے سے دور ہو گئے۔ کہنے لگی :۔

تم نے میرے ساتھ بُرا سلوک کیا ہے۔ مگر میں معاف کرتی ہوں۔ میں پھر تمہاری دیوار کو کبھی نہ چھوؤں گی۔

ریف اور زیادہ قریب ہو گیا۔ اور محبّت آمیز لہجے میں کہنے لگا :۔

میں نے جو کچھ کیا ہے محبّت سے مجبور ہو کر کیا ہے۔ یہ میرا نہیں۔ بلکہ دل کا قصور ہے۔ اگر مجھے تم سے محبّت نہ ہوتی۔ تو شاید یہ واقعہ ہی پیش نہ آتا۔

کزیہ نے ریف کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ اور دونوں باتیں کرتے ہوئے گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے ::

شہید تغافل

(مسٹر عاشق حسین بٹالوی بی اے)

شادی کے بعد تین مہینے کا عرصہ ریاض نے ایک نشے کی حالت میں گذار دیا۔ ریاض کے والدین اسکی آزاد طبیعت اور اسکے شاعرانہ خیالات سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ اپنی مجلس احباب میں اور دیگر اعزا کے سامنے بھی کئی مرتبہ اس آزادی کا اظہار کر چکا تھا۔ بالخصوص شادی کے معاملہ میں تو وہ اپنے تئیں تمام قیود اور پابندیوں سے آزاد خیال کرتا تھا۔ "والدین کیخدمت" وہ کہتا تھا۔ اولاد کا فرضِ اولین ہے۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ محبت میں بھی ہم والدین کی رضامندی کے ماتحت چلیں۔ محبت طبعی ہے کسی کے کہنے سے پیدا نہیں ہوتی۔ تو پھر یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ایسی لڑکی سے جس کو ہم نے عمر بھر نہیں دیکھا جس کے مذاق اور خیالات کے متعلق ہمیں قطعی کوئی علم نہیں اور جو سوئے اتفاق سے ہمارے ساتھ وابستہ کر دی گئی ہے محض والدین کی خوشنودی اور جبر کی وجہ سے محبت کریں۔ یاد رکھو وہ محبت جو کسی بیرونی زور سے پیدا ہو یا جس کی بنا کوئی خود غرضانہ ہوس ہو۔ ہرگز محبت نہیں ہوتی۔ خود غرضی کی ابتدا محبت کی موت ہے۔ ایسی ہی جبری اور خلاف طبیعت شادیاں ہمارے ہاں رائج ہیں۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ ہندوستانی خاوندوں کو اپنی بیویوں سے عشق نہیں بلکہ ہمدردی ہوتی ہے۔ عورت ہی تو دنیا کا بہترین سرمایہ ہے۔ عورت ہی تو خالقِ ازل کی حسین ترین صناعی ہے۔ اور عورت ہی ادب و اخلاق کی سب سے بڑی معلمہ ہے۔ اور جب اسی نایاب نعمت کو

حاصل کرنے میں جو ہماری انتہا مسرتِ حیات ہے۔ ہمارے جذبات و انتخاب کی پروا نہیں کی جاتی۔ تو کیا یہ ظلم نہیں۔ حیف ہے اس شادی پر جسکی بنیاد عشق پر نہ ہو۔

ریاض اپنے ان خیالات کی وجہ سے یا اس کی بڑھی ہوئی خوش قسمتی کہیئے کہ وہ ہندوستان کے جذبات کش طرز انتخاب سے بچ گیا۔ اس کی بیوی اس کی برسوں کی محبت کا نتیجہ تھی۔ رسمی شادی سے قبل وہ بارہا ایک دوسرے سے ملاقات کر چکے تھے۔ اور ان کو یقین تھا۔ کہ باہم ملنے پر ان کی روشن و رنگین زندگیاں ایک ناقابل بیان انبساط و سرور سے معمور ہو جائینگی۔ اور فی الحقیقت ایسا ہی ہوا۔ تین مہینے تک ریاض اپنی متاعِ حیات و مایۂ زیست گوہر میں جذب ہو کر رہا۔ وہ خود کو ایک جسدِ بے جان تصور کرتا تھا۔ اور گوہر کو روحِ رواں دونوں سے ملنا تو تقریباً اس سے چھٹ گیا تھا۔ دن کا بیشتر حصہ وہ گھر ہی میں رہتا۔ سیر یا ہوا خوری کے لئے باہر جانا بھی وہ بے سود سمجھتا تھا۔ کائنات کا تمام حسن بیرونی دنیا کی تمام دلچسپیوں کا ماحصل اب اسکے پاس موجود تھا۔ وہ باہر کیوں جاتا۔

ریاض بی۔ اے کر چکا تھا۔ اس کی آئندہ زندگی کا پروگرام اسکے والدین نے مرتب کر رکھا تھا۔ اس کو اب انگلستان جانا تھا۔ کہ وہاں سے چار سال کے مطالعہ اور محنت کے بعد انجنیر بن کر واپس آئے۔ اس پروگرام کو تبدیل کرنے کی ہمت اس میں نہ تھی۔ اور نہ ایسا کرنا وہ جائز سمجھتا تھا۔ کیونکہ اس کی ترتیب میں بہت حد تک خود اسکی رائے کا دخل تھا۔ گوہر سے علیحدگی بظاہر اس کے لئے قیامت خیز تھی۔ لیکن جب وہ خیال کرتا کہ چار سال کی جدائی کے بعد ایک پُرامن و آسائش زندگی ان کی منتظر ہے۔ وہ زندگی جس کا خوشگوار خواب وہ کئی سال سے دیکھ رہا تھا۔ تو اس کے فراخ چہرہ پر ایک مخفی تبسم

ظاہر ہوجاتا۔ اس کی نیم وا آنکھیں اس موہومہ زندگی کے دلفریب منظر کی سیر میں مصروف ہوجاتی تھیں۔

(۲)

روانگی انگلستان سے کچھ روز قبل ریاض اپنے عالیشان مکان کے ایک خوبصورت آراستہ کمرہ میں بیٹھا۔ گوہر کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ گوہر اس آنے والی جدائی سے بے خبر نہ تھی۔ لیکن وہ کیا کر سکتی تھی؟ سب سے زیادہ ڈر اُسے اس بات کا تھا۔ کہ کہیں انگلستان کی گوناگون دلچسپیوں میں محو ہو کر ریاض اسکو بھلا نہ بیٹھے۔ ریاض کا تغافل وہ اپنے لئے موت سے بدتر سمجھتی تھی۔ لیکن اس کا یہ خدشہ غلط نہیں کہا جا سکتا۔ یہ محض امکان ہی نہ تھا۔ بلکہ اس کے سامنے اس امر کی کئی زندہ شہادتیں موجود تھیں۔ وہ دیکھتی تھی کہ ہندوستانی نوجوان طلبا جن کے دل اور دماغ ابھی غیر پختہ ہوتے ہیں۔ انگلستان کی مادیت آباد زمین میں اثرات ماحول اور وہاں کی معاشرت سے مغلوب ہو کر اپنے تئیں کھو بیٹھتے ہیں۔ اور ان کے عزیزوں کی وہ تمام توقعات جو ان کے یوروپ بھیجنے سے وابستہ ہوتی ہیں۔ دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ لیکن جب وہ ریاض کے بے تابانہ اظہار تعشق پر نگاہ ڈالتی تو اسکو اپنا گمان غلط معلوم ہوتا۔ اِن خیالات سے متاثر ہو کر اس نے ریاض سے کہا:۔

گوہر۔ "ریاض پیارے تم انگلستان جا رہے ہو۔ تمہیں وداع کرنے کو دل تو نہیں چاہتا۔ مگر حصول آرام کا یہی طریقہ ہے۔ کہ پہلے تکلیف اٹھائی جائے چار سال بڑا لمبا عرصہ معلوم ہوتا ہے۔ عیش و امن کی زندگی میں چار سال آنکھ جھپکتے گذر جاتے ہیں۔ مگر فراق کے چار سال ایک کوہ گراں ہے۔ دیکھو پیارے مجھے

وہاں جا کر بھلا نہ دینا۔"

ریاضؔ بے تاب ہوگیا۔ اس نے گوہر کے حنا آلود ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں نرمی سے دبایا۔ "پیاری گوہر" وہ بے خود ہوکر بول رہا تھا۔ اور اس کی آواز میں نمایاں تھرتھراہٹ تھی۔ "تم میری مسرت اور راحت تم ہو۔ میری دنیا بھر کی خوشیاں تمہارے ساتھ وابستہ ہیں۔ تمہاری خدمت میری عین راحت ہے۔ تمہیں بھول جانا اپنی خوشی کو عمداً ضائع کرنا ہے۔ تمہاری یاد ہمیشہ میری روح کے لئے تقویت کا باعث ہوگی۔ تمہارا روح پرور تصوّر میری زندگی کے تمام لمحوں میں میرے دماغ میں موجود رہے گا۔

جان سے پیاری گوہرؔ اگر محبت بھی کوئی مادی شے ہوتی۔ اور اسکی مقدار مقرر ہوتی۔ تو شاید میں تم کو بتا سکتا۔ کہ میرا دل تمہیں کس شدت سے پیار کرتا ہے۔ چار سال کی جدائی کے بعد ہم ہمیشہ کے لئے یکجا ہو جائیں گے۔ میں تو جب کبھی اس زندگی کا ان لامتناہی مسرّتوں کا تصور کرتا ہوں۔ جو تمہارے ساتھ رہنے پر پیدا ہوں گی۔ تو میرا رواں رواں خوشی سے لبریز ہو جاتا ہے۔ گوہر! یہ چار سال کا عرصہ گذار لو۔ اس کے بعد ایک نشاط آمیز زندگی ہمارے لئے چشم براہ ہے۔"

ریاضؔ انگلستان روانہ ہوگیا۔ جدا ہوتے وقت دونوں کی آنکھیں ملیں۔ وفور غم سے الفاظ گلے میں پھنس کر رہ گئے تھے۔ لیکن آنکھوں ہی آنکھوں میں انہوں نے الوداعی پیغام کہدیا۔ گوہر کا چہرہ یاس و حسرت سے پژمردہ ہو رہا تھا اس نے اپنی جان و دل کے مالک ریاضؔ کو اپنے سے ہزاروں کوس دو چار سال کے طویل عرصے کے لئے علیحدہ کر دیا تھا۔ مستقبل کے متعلق وہ کوئی صحیح رائے قائم نہ کرسکتی تھی۔ شعاع امید اسکے سامنے تھی۔ لیکن اسکا مستقبل

ہونا یقینی نہ تھا۔ ریاض نے بمبئی سے جہاز پر سوار ہوتے وقت اور پھر جہاز میں سے کئی خطوط گوہر کے نام لکھے۔ اس کو درحقیقت گوہر سے عشق تھا۔

(۳)

انگلستان کی مصروف اور لاابالی مشترک زندگی ہندوستانی نوجوانوں کو ہمیشہ ایک معمہ نظر آتی ہے وہ چاہتے ہیں کہ اپنے گردوپیش کی حسین اور جاذب توجہ اشیائے سے آنکھیں بند کرکے اپنے کام میں لگے رہیں اور فراغت کے وقت دماغ کو تمام فرائض کے احساس سے محروم کرکے وہاں کی جدید دلچسپیوں میں بدرجۂ اُتم حصہ بھی لیں۔ لیکن تجربہ کی خامی اور وہاں کی طرز معاشرت سے کماحقہٗ واقف نہ ہونے کے سبب وہ افراط و تفریط کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور کام اور تفریح میں جو مساوات وہ قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ نہیں رکھ سکتے۔ ریاض گلاسگو کی یونیورسٹی میں داخل ہوگیا۔ اور اپنا چار سالہ کورس شروع کردیا۔ اپنے لئے موزوں جائے رہائش تلاش کرنے اور دیگر ابتدائی ضروریات پورا کرنے میں مصروف رہنے کی وجہ سے وہ گوہر کو بہت مفصل خط نہ لکھ سکا۔ فرصت کے وقت اسکو اکثر گوہر یاد آتی تھی۔ لیکن خط لکھتے وقت وہ اس بات کی احتیاط رکھتا تھا۔ کہ مصائب فرقت کا اس سے بے تابانہ اظہار نہ ہونے پائے۔ وہ گوہر کو ہمیشہ محبت آمیز تسلیاں لکھ کر بھیجتا تھا۔

(۴)

ریاض کو انگلینڈ میں دو سال گذر چکے تھے۔ انگلستان کی پُرمشاغل سرزمین میں رہ کر اب اسکو کہاں فرصت تھی۔ کہ وہ اپنی توجہ ہندوستان کی طرف بھی مبذول کرتا۔ ڈیڑھ سال تک تو وہ گوہر کو برابر خط لکھتا رہا۔ مگر اب اسکے دل میں گوہر کے عشق کی چنگاری بجھ رہی تھی، ولایت کے نمائشی

اور فوق البرق لباس والی نازنین لڑکیاں اسکو مبہوت کرنے کے لئے کافی سے زیادہ تھیں۔ لیکن پھر بھی اس قدر احساس باقی تھا۔ کہ وہ ہستی جس کا رواں رواں اس کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس پر کچھ نہ کچھ اپنا حق رکھتی ہے۔ محض اس حق کو ادا کرنے اور ایک ناگوار فرض کو پورا کرنے کے لئے اب وہ خط لکھتا تھا محبت خط لکھنے پر مجبور نہ کرتی تھی۔ گوہر نے اس تبدیلی کو بخوبی محسوس کیا۔ وہ اظہار جذبات کے طریقوں سے واقف تھی۔ اب وہ ریاض کی تحریروں میں صاف طور پر تصنع، آورد، اور بناوٹ پاتی تھی۔ اس کی محبت اسے جھوٹی نظر آنے لگی۔ اس تلخ اور خوفناک حقیقت کا انکشاف اس کی جان کا روگ ہوگیا۔ اس نے ریاض کو درد و حسرت سے لبریز خط لکھے۔ مگر ریاض ہندوستانی ریاض گوہر کا عاشق زار ریاض نہیں۔ بلکہ انگریزیت پرست۔ دلدادہ نمائش ریاض کو کہاں فرصت تھی۔ کہ ہندوستانی نادان لڑکی کی چیخ پکار کی طرف متوجہ ہوتا۔ وہ ان خطوں کو جو ایک وقت میں اس کے لئے نوید عیش و مسرت ہوا کرتے تھے۔ اب نوحۂ غم سمجھتا تھا۔ اور چاہتا تھا۔ کہ اسکی جدید پرعشرت زندگی میں اسکے کان جو نغمہائے شیریں سے مانوس ہو چکے ہیں۔ اس نوحہ سے ناآشنا ہی رہیں۔ آہ وہ کس قدر ظلم کر رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے گوہر کو خط لکھنا بالکل بند کر دیا۔ ہفتے اور مہینے گذر جاتے ہیں۔ مگر گوہر بدستور انتظار مجسم ہے۔ اس کی آنکھیں ریاض کی تحریر دیکھنے کی منتظر ہیں۔ مگر ریاض کی سنگین خاموشی اسکی آرزوؤں کو ہمیشہ کے لئے سلا رہی ہے۔ ہزاروں کوس کے فاصلہ پر صرف خط و کتابت کا ہی سلسلہ تھا جس نے دونوں کی روحوں کو باہم پیوستہ کر رکھا تھا۔ مگر اب وہ تعلق بھی منقطع ہو چکا تھا۔ گوہر اب کس آس پر زندگی بسر کرتی؟ وہ شخص جسے وہ اپنا تصور کر رہی تھی جس کی محبت پر اُسے ناز تھا۔ اب وہی اسے ایک غیر

ضروری چیز سمجھ کر اپنے سے علیحدہ کر رہا تھا۔ جب وہ مستقبل کے متعلق خیال کرتی۔ تو بیم و یاس کی ہولناک تاریکی سے اسکا دل لرز اٹھتا تھا۔ "کیا ریاض کی تمام الفت ایک مسلسل منافقت تھی؟ کیا ریاض کا تمام عشق ایک دھوکا تھا؟" وہ اس کی پرشوق نگاہوں کا۔ اسکی وارفتگی محبت کا تصور اپنے دماغ میں لاتی۔ اور پھر اسکا مقابلہ موجودہ سرد مہری سے کرتی۔ تو اسکے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔

ریاض کے الوداعی الفاظ کہ "گوہر یہ چار سال کا عرصہ گذار لو۔ اسکے بعد ایک نشاط آمیز زندگی ہمارے لئے چشم براہ ہے"۔ اب اسے بے حقیقت خطرناک مروانہ مذاق معلوم ہو رہا تھا۔ مہینوں گذر گئے۔ مگر ریاض کے دلخراش سکوت میں مضبوطی ہی پیدا ہوتی ہو گئی۔ گوہر کو اب یقین ہو گیا۔ کہ یہ سارا ماجرا ایک خواب تھا جس کی مصنوعی دلفریبیاں اب تک اسے مسحور کئے ہوئے تھیں۔ اسے اب معلوم ہوا کہ مرد کی محبت تارِ عنکبوت سے زیادہ کمزور اور ناپائدار شے ہے۔ اس پر اعتبار رکھنا آگ کے شعلوں سے کھیلنا ہے۔ کاش کہ ریاض اپنی دلبستگیوں میں یہ بھی خیال کرتا۔ کہ ایک کمزور ذی روح ہستی اپنا تمام متاع حسن و انبساط اسکے سامنے ڈال کر اسکی ایک تبسم نگاہ کی متوقع ہے مانا کہ ریاض کے دل سے اب گوہر کی محبت زائل ہو چکی تھی۔ مگر اسکو چاہیئے تھا۔ کہ اسکی زلیست کی بقا کے لئے وہ کم از کم اسکو خط ہی لکھتا رہتا۔

(۵)

اس تغافل کا لازمی نتیجہ گوہر کی صحت پر ظاہر ہوا۔ اگر کوئی اور لڑکی ہوتی تو شائد اس قدر اثر پذیر نہ ہوتی۔ مگر گوہر تو غیر معمولی طور پر سریع الاحساس تھی۔ عورت کو اگر انتہائی یاس کے عالم میں دیکھنا ہو۔ تو اس وقت دیکھو جب وہ ناکام محبت ہو۔ گوہر کو اپنے تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ وہ اب بھی حسین تھی۔ مگر

پژمردہ کلی کی طرح۔ وہ گھنٹوں محوِ خیال رہتی۔ اور بسا اوقات اپنی کمزور طبیعت پر قابو نہ پاکر پہروں رویا کرتی تھی۔ ریاض کی بے وفائی نے اسکی روح کو گھلا دیا تھا۔ زندگی دہر کا یہ تکلیف دہ سبق اس نے حیرت کے ساتھ پڑھا۔ اور اس پر اب واضح ہؤا۔ کہ مرد کس قدر چاپلوس۔ کتنے بیمروت اور کیسے بیوفا ہوتے ہیں۔ اپنی غرض کے لئے وہ مفاد غیر کو کس سنگدلی سے قربان کر دیتے ہیں۔ گوہر کے والدین اسکی صحت کی کمزوری سے بڑے متفکر ہو رہے تھے۔ انہوں نے بیسیوں علاج کئے۔ مگر گوہر کے درد کا درمان ممکن نہ تھا۔ عورت کی تمام بیماریوں کا علاج مرد کی محبت ہے۔ گوہر کا چہرہ ہر وقت آلام و تفکرات کا مسکن بنا رہا تھا۔ اور وہ خود محسوس کرتی تھی۔ کہ اسکی روح اندر سے کشید کی جا رہی ہے۔ ہلکا ہلکا بخار گوہر کی ہڈیوں میں ٹھہر گیا تھا۔ کھانسی اور زکام گھڑی بھر کے لئے جدا نہ ہوتے تھے۔ وہ بے انتہا لاغر ہو گئی تھی۔ اب اسے صحت یاب ہونے کی قطعی امید نہ تھی۔ جب وہ چاروں طرف سے مایوس ہو چکی۔ جب امید کی آخری ٹمٹماتی ہوئی شعاع اسکے سامنے بجھ کر رہ گئی۔ جب یاس کی ناقابل شگاف گھٹائیں ہر طرف سے اسپر امنڈ آئیں۔ تو اس نے ایک رات بصد دقت لمپ کی روشنی میں ذیل کا خط ریاض کے نام لکھا۔

داغ کچھ درہم نہ تھا جسکا انہیں ہوتا خیال
ہو گیا گم ہو گیا۔ جاتا رہا جاتا رہا۔

پیارے ریاض اگر میری ندائے درد تمہاری عشرت خیز زندگی میں چند گھڑی کے لئے مخل ہو تو مجھے معاف کر دینا۔ میرا کوئی حق نہیں کہ تمہاری خوشیوں میں رخنہ ڈالنے کی کوشش کروں۔ میرا دل قابو سے باہر ہو رہا ہے۔ اور ایک موہوم خواہش سے میرا سینہ پھٹا جاتا ہے۔ کاش کہ تمہیں

اتنا معلوم ہوتا کہ تمہاری گوہر کی زیست کا سہارا تمہاری نگہ التفات ہے۔ تمہارے لئے انگلستان جیسی سدا بہار سرزمین میں بیسیوں سوسائیٹیاں اور مجلسیں ہیں۔ جہاں تمہاری کلفت کی تلافی ہر ممکن طریقہ سے ہو سکتی ہے۔ مگر مجھ حرماں نصیب کے لئے تمہارے نام کا وظیفہ ہی ہے۔ جب دل بہت بے قرار ہو جاتا ہے۔ تو تمہارے گذشتہ خطوط جن سے محبت کی خوشبو آتی ہے پڑھتی ہوں۔ اور سینکڑوں بار چومتی ہوں۔ مجھے یقین نہ تھا۔ کہ تمہاری محبت اس قدر جلد بدل جانے والی ہے۔ اس مفروضہ زندگی کے آنے والی دلفریبیوں کے مناظر کا تصور کیا کرتی تھی۔ جو تمہارے ہندوستان واپس آنے پر پیدا ہوں گی۔ مگر آہ۔ ریاض پیارے! میری امیدوں کا خون کس حسرتناک طریقہ سے ہوا۔ میری زندگی ویران ہو گئی ہے۔ سنا کرتی تھی کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ ممکن نہیں۔ کہ ایک شخص دوسرے کی محبت میں سرشار ہو اور دوسرا اسکا جواب تغافل اور سنگدلی سے دے۔ مگر تجربہ نے اس پر مہر تصدیق نہ لگائی۔ اسوقت رات کے سناٹے میں جب سب خاموشی سے سو رہے ہیں۔ میرا دل آگ کی طرح بھڑک رہا ہے۔ مجھے کسی پہلو کل نہیں۔ اور یہ حالت آج سے نہیں بلکہ مہینوں سے ہے۔ میری بیماری کا حال تو تم نے سُن ہی لیا ہوگا۔ والدین ڈاکٹری ادویات کے استعمال میں کوشاں ہیں۔ مگر مجھے یقین ہے۔ کہ اگر ایک بار تمہارا پرتبسم پیارا چہرہ دیکھ لوں۔ تو یہ تمام بیماری کافور ہو جائے۔ ریاض! خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو۔ میرا دل تمہاری پرستش کرتا ہے۔ میرے دن اور میری راتیں تمہیں کیا معلوم کیسے گذر رہی ہیں۔ یہ زمانہ ایک پہاڑ ہے جس کے ٹلنے کی کوئی امید نہیں۔ یہ بیماری اب مجھ سے جدا نہیں ہونے کی بیسیوں علاج ہوئے۔ مگر شفا تو تمہارے ہاتھ نہیں ہے۔ اب زندگی کی آس منقطع ہو

چکی۔ میرا یہ آخری عریضہ تمہاری خدمت میں پہنچتا ہے۔ اسکے بعد تم انشاءاللہ یہی سنو گے۔ کہ فرقت نصیب گوہر اپنے جان سے پیارے ریاض پر قربان ہو گئی۔ دل تو یہی چاہتا تھا۔ جان تمہارے ہاتھوں میں نکلتی۔ مگر قسمت نے یہ موقع بھی نہ دیا۔

پیارے ریاض دل اندر ہی اندر ڈوب رہا ہے۔ ہاتھوں میں اب قوت نہیں رہی۔ قلم بے طرح جنبش کر رہا ہے۔ اس سہو خراشی کی مجھے معافی دیدو۔ خدا کرے تمہیں زندگی کی بہاریں دیکھنا نصیب ہوں۔

میں ہوں پیارے ریاض ہمیشہ کیلئے تمہاری

گوہر !!!!

گوہر نے خط لکھنے کے بعد ایسا محسوس کیا کہ اسکی روح پر سے کوئی بھاری بوجھ اتر گیا ہے۔ وہ ایک ضروری فرض ادا کر چکی تھی۔ اب وہ اپنے تئیں زیادہ مطمئن پاتی تھی۔ مگر وہ اطمینان کیفیت اضطراب سے کہیں زیادہ تکلیف دہ تھا۔ کمرے کی تاریک دیوار پر جو لمپ کی ناکافی روشنی میں دھندلی سی نظر آتی تھی۔ اسکی آنکھیں جمی ہوئی تھیں۔ شاید وہ اپنی قوت متخیلہ سے عہد گذشتہ کے واقعات کو دوبارہ اپنے سامنے لا رہی تھی۔ اسکا چہرہ حسرت و اندوہ کی زندہ تصویر تھا۔ اس بات کا تیقن کہ اب وہ زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتی۔ ریاض کو جسکا خیال اسکے دل و دماغ پر مستولی تھا۔ اب آخری مرتبہ بھی وہ نہیں دیکھ سکتی۔ اپنی نامرادی اور بے بسی کا تصور۔ ان سب نے مل کر اسکے دماغ میں ایک ہیجان پیدا کر دیا۔ اسکا دل اُسے ایسا محسوس ہُوا۔ کہ کوئی ہاتھوں سے مسل رہا ہے۔ وہ اس بے چینی کی متحمل نہ ہو سکی۔ اسکے بیتاب لرزتے آنسو اسکے رخساروں پر گرے۔ اور گھڑی بھر میں بستر کا

تکیہ اشکوں سے تر ہو چکا تھا۔

دوسری صبح گوہر کا یہ حال تھا۔ جیسے کوئی غریب بے بس پرند قید سے تنگ آکر قفس سے نکلنے کی بے سود کوشش کرتا ہے۔ اور چند گھنٹے کی سعیٔ لاطائل سے تھک کر خود ہی نڈھال ہو کر گر پڑتا ہے۔ آج وہ بے انتہا کمزور اور لاغر معلوم ہوتی تھی۔ اسکے چہرے پر رونق اور بشاشت نام کو نہ تھی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اسکی زندگی کی گھڑیاں پوری ہو چکیں۔ اس کے عزیز و اقربا اپنے غمگین و پریشان چہروں سے اسکے گرد حلقہ کئے ہوئے تھے۔ کہ وہ شاید کچھ بولے۔ مگر مریضۂ عشق کی آنکھیں چھت کی طرف لگی ہوئی تھیں شاید وہ اب بھی اس نام کو جس نے اُسے دنیا سے بیگانہ کر دیا تھا۔ اپنے دل میں دہرا رہی تھی۔ کہ ایک ہچکی آئی۔ اور ساتھ ہی اسکی روح قید حیات کے بندھنوں سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو گئی ؎

یہ کس کا نام لے کر جان دی بیمار فرقت نے
یہ کس ظالم کا چرچا رہ گیا تیمار داروں میں

جذب دل کی دو تصویریں

(از جناب سلطان حیدر جوش ڈپٹی کلکٹر جون پور)

جذب دل ایک قوت ہے ناقابل وزن۔ ایک کشش ہے ناقابل تجزیہ۔ پیدا ہوتی ہے بغیر پیدا کئے۔ اور ناپید نہیں ہوتی بغیر ناپید کئے۔

جسم انسانی کا مرکز نظام۔ جذبات گوناگوں کا گہوارہ۔ دماغ۔ جب اپنے عمل و ردعمل کا جال اعضائے انسانی تک پہنچاتا ہے۔ تو پھیپھڑے کی ہوا کھانے والا مضغۂ لحم سیماب صفت بن جاتا ہے۔

یہ ہی برق معمور پارۂ لحم۔ جذب محبت کا نقطۂ موہوم۔ شاعری کی جان موسیقی کا مخزن۔ نقاشی کی روح رواں قرار پاتا ہے۔

اس جذب سے دلکو وہی تعلق ہے۔ جو ریڈیم کو روشنی سے آفتاب کو نور سے حسن کو پرتو سے، یا خاکم بہ دہن۔ تجھ کو مجھ سے۔ اس کا درد لذت انگیز۔ اس کی لذت درد افزا!!

یہ غنچۂ ناشگفتہ۔ جو نسیم سحر کی ہلکی سی گدگدی سے تبسم زیر لب کے ساتھ مقناطیس نظر بن جاتا ہے۔ کبھی نہ ہوتا اگر وہی پہلو میں رہ رہ کر اٹھنے والا درد لذت انگیز نہ ہوتا۔

یہ چشمۂ نغمہ نواز کی چلبلی اور سبک رو لہروں سے دست و گریباں ہو جانے والی آفتاب کی شعاعیں جو زمین کے نشیب و فراز کے ساتھ روپہلی سنہری روپ بھرتی۔ ڈوبتی اچھلتی دیدہ و دانستہ آنکھوں میں گھسی آتی ہیں۔ کبھی ہرگز نہ ہوتیں۔ اگر وہی سینہ کو آتشکدۂ جذب بنا دینے والی لذت درد افزا نہ ہوتی۔

ناممکن ہے کہ سب کچھ ہوتا اور یہ نہ ہوتا۔ ممکن ہے کہ کچھ نہ ہوتا۔ اور

یہ ہوتا!

جذب دل کائنات کی روح رواں۔ مطرب کا گلو۔ نقاش کا قلم یا شاعر کی زبان۔ اسکا ذریعہ خود نمائی!

جس وقت سے دیکھنے والی آنکھوں کا وجود ہے۔ اسی وقت سے ان ذرائع خود نمائی کا وجود ہے!

نغمہ۔ نقش اور شعر، یقیناً مغنّی، نقاش اور شاعر کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں!

ایک کا وجود ازل سے ہے تو دوسرے کا وجود بھی ازل سے ہی ہونا چاہیئے!

نغمہ، نقش اور شعر کیا ہیں؟ حسن اور اس سے پیدا ہونے والے جذب محبّت کی طرح بہ طرح خود نمائی!

خود نمائی ایک مہمل سی حرکت قرار پاتی ہے۔ اگر دیکھنے والی آنکھ نہ ہو۔ ایسی آنکھ خارج میں نہ ہونے سے اسکا عدم وجود لازم نہیں آتا۔ حسنِ خود نما بذاتِ خود۔ جذبۂ خود بینی سے بھی متصف ہے۔

خود بینی و خود نمائی دوش بدوش وجود میں آتی ہیں!

معنہ نگاری برطرف۔ جذب محبّت کے عامل و معمول افراد انسانی کے ہر دو طبقات یکساں رہے ہیں!

کسی ایک طبقہ کو عامل اور دوسرے کو معمول قرار دیدینا نقاش و شاعر کا رجحانِ طبع ہے اور بس!

فی الحقیقت اس جذبہ کے لحاظ سے ذکور و اناث میں سرِ مو فرق نہیں!

دونوں عامل ہیں۔ دونوں معمول یا دونوں عاشق ہیں دونوں معشوق!
دو مختلف الخیالات اشعار سے محض دو مختلف الطبائع شاعروں کا پتہ چل سکتا ہے۔
ایک ہی جذبہ کے دو مختلف اللون نقوش صرف نقاش کی طبیعت کی وسعت بتلاتے ہیں!
جذبہ ہر حالت میں وہی ہے۔ خواہ صنفِ قوی عامل ہو یا صنفِ نازک!
نقاش کو جس طرح نقشِ جذبات میں اپنی طبیعت کے موافق زیادہ سرور آتا ہے۔ وہ فطرتاً اسی کو اختیار کریگا۔
دیکھنے والے کو جس نقش میں زیادہ کیف نظر آئے۔ اُسکی مرضی!
عیب جوئی و مناقشہ ناظر کے عیوب ہیں۔ اظہارِ دلائل و منطق نقاش و شاعر کے ناقابل معافی گناہ ہیں!!
موازنہ مقابلۂ نقوش۔ بشرطیکہ اسکی بنا حسد و نقص جوئی پر نہ ہو۔ جوہری نقش کی صفت ضروری ہے!
مختلف زمانہ کے نقاشوں کی طبع آزمائی اس زمانہ کی شعریت و جذبِ دل معلوم کرنے کا بہترین ذریعہ ہے!

(۱)

نینی تال کے اس حصہ میں جہاں تلی تال کا جگمگاتا پانی پیالۂ کوہستانی کے پیندے میں عجیب نظر فریب شانِ سکوت کے ساتھ غرق محویت نظر آتا ہے۔ اور اسوقت جبکہ پہاڑوں پر جھاڑو دینے والا دخان سحاب مخلوقات متحرک و غیر متحرک کو محض اپنے مس ہو جانے سے نم کر چکا تھا۔ ایک موٹر بوٹ پر دو صورتیں پہلو بہ پہلو فطرتِ بوقلموں کی حسن پاشی اور نظر نہ آنیوالے

دست قدرت کی دلربا دستکاری کی لذت یابی میں مستغرق تھیں۔ پہاڑ پر جھکنے والا آفتاب سحاب دخانی کے اڑنے والے گالوں سے چاور چھپول کھیلنے میں مصروف تھا۔ اور وہ رہ کر پانی کی سطح پر لوٹ جانے والی دھوپ کی شعاعیں تلی تال کو سنہری تال بنا جاتی تھیں! کشتی پر محو نظارہ یا غرق جذبات ہونے والی صورتوں کے چشم و ابرو ایک دوسرے کے ساتھ عمل ورد عمل کا پتہ دیتے تھے۔ دونوں چہرے بال کے وبال سے صاف تھے۔ ایک فطرتاً دوسرا سیفٹی ریزر کی امداد سے! دونوں سر ننگے تھے۔ ایک پر چھوٹے چھوٹے بھورے بال اور دوسرے پر سنہری بل کھانے والی زلفیں۔ جو چھوٹی چھوٹی لٹوں کے چھلے گوری گردن کے ادھر ادھر خوبصورت کانوں سے سرگوشی کرنے کے لئے چھوڑتی ہوئی خود کمر تک جا پہنچتی تھیں۔ دونوں جذبۂ اتصال طلب سے معمور تھے۔ دونوں نظر اغیار کی مداخلت بے جا سے گریزاں تھے۔ اور دونوں قصّہ مختصر کسی نہ کسی طرح ایک ہونا چاہتے تھے۔

نوجوان اپنی کیفیت اندرونی کے اظہار کا فرض مقدس مدِ مقابل کے محراب ابرو کے سامنے۔ لہجۂ شوق لب ریز کے ساتھ ادھ کٹے جملوں میں ادا کرتا تھا نازنین جذبۂ مشترک کی اشتعال آفرینی کو تصنّع خودداری سے دبا لئے۔ الفاظ مسرت آگین کے میٹھے گھونٹ گرم رخساروں، عرق آلودہ جبیں۔ اور جھکی ہوئی نظروں کے ساتھ پی چکی تھی! اور ان کا سرور خود فراموشی۔ دل سے لے کر دماغ تک۔ ہر سانس کے ساتھ بڑھ رہا تھا! ایک مجسّم التجائے تمنا لب ریز۔ دوسری سراپا رضائے شرم آمیز!!

ترشح دخانی کے تازے پانی میں نہائی ہوئی ہوا کا ایک شریر جھونکا۔ تلی تال کی سطح مصفا پر پھیلتا۔ خاموش لہروں کو گدگداتا۔ موٹر بوٹ تک پہنچا

اور آنِ واحد میں دونوں اجسام جذبات معمور کے ساتھ وہی عمل کرگیا۔ جو شام مین کا دور آخریں کسی مجلس بادہ پیمائی میں مخمور دماغ کے ساتھ کرجاتا ہے۔ کوہستان کی سطح ناہموار پر۔ آفتاب وسحاب کی چاور چھپول کی بدولت۔ دھوپ چھاؤں کا مدوجزر اِدھر اُدھر بل مارتا نظر آتا تھا۔ دیکھنے والی نظریں کبھی روشنی کو سایہ کے پیچھے اور کبھی سایہ کو روشنی کے پیچھے دوڑتا ہُوا مشاہدہ کرتی تھیں۔ سایہ روشنی کو پکڑنا چاہتا تھا۔ یا روشنی سایہ کو۔ ایک ایسا معمّہ تھا جس کو کوئی نہ حل کرسکا۔ البتہ اس مشاہدۂ مناظر سے پیدا ہونے والا کیف۔ دماغ گرم کو آتشکدۂ جذب بنا جاتا تھا۔ نوجوان کی چشمِ تمنا وا ہوئی۔ نازنین کا سرِ تسلیم خم ہُوا۔ میری پیاری روحِ درواں کا جملہ ایک زبان سے نکلا۔ ”خموشی معنئ دارد کہ در گفتن نمے آید“ کا جواب دوسرے کے سکوت نے دیا۔ نوجوان کا سر جھکا۔ نازنین کا چہرہ اس کی طرف مڑا۔ آنکھیں چار ہوئیں۔ دو دل مِل گئے۔

(۲)

صوبۂ متوسط کے اس حصّہ میں جہاں راجہ بھیم کے طاقت ور ہاتھ وِدَاربھ کی عنانِ حکومت سنبھالے ہوئے تھے۔ اور اسوقت جبکہ نشادہ کی ہمسایہ راجدھانی پر راجہ نل حلم وعفو کے ساتھ انصاف گستر تھا حسین دمینتی کے آفتاب حسن نے اپنی شعاعوں کا انعکاس ہر چہار سمت شروع کیا۔

دمینتی کے حسن نے خصوصیت کے ساتھ نوجوان نل کے دل و دماغ پر وہی عمل کیا۔ جو آفتاب شیشۂ آتشین پر کرتا ہے۔ اور طرحدار نل کی زور آوری و ہر دل عزیزی نے بھولی بھالی دمینتی کے جذباتِ نوخیز پر ردِ عمل کرنے میں ”جواب ترکی بہ ترکی دیا۔ نل۔ جلوۂ منو۔ فخر روزگار تھا۔ دمینتی ”دعائے مہا نمادمن“۔ افتخار لیل ونہار تھی! مرغِ پیغامبر“ راج ہنس“

نے جذبات طرفین کو جذب محبت میں مبدل کر دیا۔ رفتہ رفتہ کشش باہمی۔ اجتماع شرافت وحسن کا دیباچہ بن گئی۔ یہ لیل و نہار تھے۔ کہ راجہ بھیم کو اپنی حسین کنیا دمینتی کے حدود شباب میں قدم رکھنے کا احساس ہوا۔ اور اس احساس کا ہونا تھا۔ کہ نوجوان راجپوتوں کو اس حسین ماہ جبین کے انتخاب زوج کے لئے شرکت سومبر کی دعوت عام دی گئی۔

مقدس بھارت ورش کے ہر گوشہ سے نکیلے سجیلے چھبیلوں کا ٹڈی دل بڑے تزک و احتشام کے ساتھ ودار بھ کی راجدھانی کی طرف چل نکلا۔ ہاتھیوں گھوڑوں اور رتھوں کی تعداد کثیر نے قطع مسافت میں ایک طبقۂ ارض کو آسمانِ ہشتم بنا دیا۔ نارد اور پاربت نے کوہ مرو سے جنت سورگ کی راہ لی۔ اور دیوتائے سحاب۔ اندر کے مرکز سکون کو دمینتی کے حسن صبر سوز کی رام کہانی سنا کر جنبش دی۔ دیوتا بھی حسن ہوشربا سے کیف حاصل کرنے کے لئے پرتھوی کے مشہور راجہ بھیم کی حدود راجدھانی میں شرکت سومبر کی غرض سے نازل ہوئے سومبر کا روز مقررہ آیا۔ دوپہر کے قریب تمام راجہ مہاراجہ اپنی اپنی فرودگاہوں سے ایوان جشن میں بلائے گئے۔ ہر نوجوان راجپوت۔ انمول جواہرات زیب سروگوش کئے نکھ سے سکھ تک بنا سجا۔ ایوان وسیع میں داخل ہوا۔ راجہ بھیم کے اظہار خلق و مہمان نوازی کا لطف اٹھاتا ہر ایک علیحدہ علیحدہ ایک تخت مرصع پر متمکن ہو گیا۔ تمام ایوان وسیع اظہار شان و شوکت سے جگمگا اٹھا تمام مجلس کو شمش خود نمائی سے گرما گئی۔ تمام نوجوان منچلے اپنی آن بان کی نمائش انتہائی میں ایسے شیران پر غیض کی تصویر بن کر رہ گئے۔ جو ایک ہی شکار کی تلاش میں دفعتہً آمنے سامنے ہو گئے ہوں!! اسی اژدھام زیبائش و خود آرائی میں طرحدار نل بھی ایک گوشہ میں مضطرب تمناؤں کو

روکے۔ نچلے نہ رہنے والے دل کو تھامے۔ غرقِ جذباتِ امید و یاس تھا! اِسکے پہلو میں چاروں دیوتا۔ اندر۔ اگنی۔ ورون اور یام۔ بصورتِ انسان محبت و حسن کی کرشمہ سازیوں کا تماشہ دیکھنے کو موجود تھے۔ ان کو حسین و مہینتی اور نوجوان نل کے باہمی جذبات کا علم اچھی طرح ہو چکا تھا۔ اسی لئے وہ کسی گل کھلانے پر آمادہ نظر آتے تھے۔

تمام مجلس گرم پر سکوتِ موت طاری ہو جاتا ہے۔ ہر صورت خندان پیکر تصویر بن جاتی ہے۔ ایک ایک نگاہ شوق و تمنا میں ڈوبی ہوئی۔ آنے والی حسن کی پتلی کی طرف کھینچ کر رہ جاتی ہے۔ جب مہ جبین دمینتی سومبر کی مجلس میں داخل ہوتی ہے۔ سرخ ریشمی محرم اور بنارسی ساری اسکے دلآویز تناسب اعضا کو اپنا سحرِ سامری کرنے کا پورا موقع دیتے ہیں۔ طلائی و مرصع تاگڑھی کمر نازک کے حدود بالائی وزیرین کے تشیب و فراز کا اظہار ناقابل بیان دلفریب رنگ میں کرتی ہے۔ جڑاؤ جھومر اور بے بہا آویزہائے گوش۔ جبیں نظر فریب اور رخسار سرخ و سفید پر اس غضب کی جھمک ڈالتے ہیں۔ کہ ناظرین بلا ارادہ و کوشش ہمہ تن چشم بن کر رہ جاتے ہیں۔ سر سے پیر تک رعنائی و عنفوانِ شباب کی کیفیت ایسی بلا کی کرشمہ نمائی کرتی ہے۔ کہ ایک ایک عضو کی نذر کے لئے کم از کم ایک دل کی حاجت محسوس ہونے لگتی ہے۔ وہ اپنے گورے گورے نازک ہاتھوں میں ایک خوشنما ہار لئے، نظر نیچی کئے آہستہ آہستہ قدم رکھتی اِس محفلِ شوق میں داخل ہوتی ہے۔ داخل ہوتی ہے۔ اور ہزاروں گرم گرم نظریں سر سے پیر تک اس پر لوٹ جاتی ہیں۔ صاف و شفاف پیشانی پر دوشیزگی و بھولے پن کی حیا ننھے ننھے شبنم کے سے قطرے پیدا کر دیتی ہے۔ محسوس نہ ہونے والا سانس تیز رفتاری سے

کام لیتا ہے۔ سبک رفتار قدم وزنی ہو جاتے ہیں اور وہ کسی قدر بڑھ کر ٹھٹک جاتی ہے!!

اس آن واحد میں ہر راجپوت دل ایک غرور آمیز انگڑائی لیتا ہے۔ ہر منچلا دماغ بجائے خود مقناطیس محبت بن جاتا ہے ہر جوان اپنے سینہ و بازو پر ایک نظر ڈال کر اکڑ جاتا ہے۔ مگر دمینتی کی جھکی ہوئی نظریں اس مہمل اظہارِ حسن فریبی کو مطلق نہیں دیکھتیں۔

دمینتی دراصل ایک صورت کو پہلے سے ہی اپنے پہلو میں جگہ دے چکی تھی اور اب وہ محض اسکی متلاشی تھی۔ وہ رک رک کر حجاب و حیا سے بار بار اجازت لیتے ہوئے کن انکھیوں سے چاروں طرف نظر غلط انداز ڈال رہی تھی۔ دیکھتے دیکھتے وہ اس طرف بڑھی۔ جہاں مضطرب نل امید و بیم سے دست و گریباں ہو جانے کی کیفیت میں محو تھا۔ مگر قریب پہنچتے ہی وہ پھر سکتہ کے عالم میں تھی۔ یہاں دوش بہ دوش پانچ نل اسے جلوہ آرا نظر آتے تھے۔ اسکا دل دھڑک رہا تھا۔ سانس الجھ رہا تھا۔ شرم و حیا نے اسکے اوسان کھو دئے تھے۔ وہ ہزار ہزار کوشش کے بعد بھی ان پانچوں صورتوں میں سرمو فرق نہ معلوم کر سکی۔ ہر صورت اسکی نگاہ متجسس کو اپنی ہی طرف کھینچے لیتی تھی۔ ان میں ہر ایک اسے راجہ نل معلوم ہوتا تھا دماغ بتاتا تھا۔ کہ نل ایک ہے۔ آنکھیں بتاتی تھیں کہ نہیں پانچ ہیں۔ دل مچلتا تھا۔ کہ مجھے اپنے دلربا سے کام ہے۔ بیچاری دمینتی آنکھیں بند کر کے دیوئ حسن و محبت کی جناب میں۔ تخیلات کی امداد سے جھک گئی۔ جھک گئی۔ اور بصد زاری اپنی امداد کی التجا کرنے لگی۔

نل کا روپ دھارن کرنے والے دیوتا نل کے دوش بہ دوش امتحانِ جذبہ محبت میں مصروف تھے۔

دمینتی نے ان کی نہ جھپکنے والی آنکھ سے یا پرچھائیں نہ پڑنے والے جسمِ لطیف سے ان کو تاڑ لیا۔ مگر پھر بھی خوف و رجا کا عالم اس پر طاری تھا۔

حُسن کی دیوی ہو یا عشق کا دیوتا۔ ایک غیبی رہنمائی اسکے پریشان دِل کو آخر کار یک بیک نصیب ہوئی۔

اس نے اپنے معمورِ محبت دل سے دستگیری چاہی۔ نظریں جُھکائیں۔ نل کو اپنے ہی اندر تلاش کرنا چاہا۔ اور بیک چشم زدن فوراً آگے جھک کر ان پانچوں صورتوں میں سے ایک کے گلے میں ہار ڈال ہی دیا۔ آنکھیں اُٹھیں نظریں ملیں۔ اور واقعی دمینتی کا جذبہ محبت راجہ نل کے گلے کا ہار تھا۔

قیس عامری مدعی ہے کہ لیلیٰ کے حسن صبر سوز پر اسکا عاشق ہو کر جان دینا بالکل قرینِ فطرت ہے۔

دمینتی کہتی ہے کہ نل کے جذبِ صادق کی قدر دمینتی کے انتخابِ عشاق سے بدرجہا بیش بہا اور شعریت معمور نظر آتی ہے۔

میں متحیر ہوں کہ لیلےٰ کے دیوانہ کو فرزانہ سمجھوں یا ہندوستان کی شرم وحیا کی پتلی کو۔

ایک سودائی ہی چیخ اٹھتا ہے کہ :-

عشقِ لیلےٰ نیست ایں کارِ من است
حسنِ لیلےٰ عکس رخسارِ من است

خورشید و قمر

افسانہ نگار نے اپنے نام کی بجائے باغبان کا لفظ اختیار کیا ہے۔ ہم بھی اصل حقیقت کو مستور رکھتے ہوئے یہ افسانہ درج کرتے ہیں۔ افسانہ نگاروں کے حالات میں ہم نے انہیں بے نقاب کر دیا ہے۔ ذوقِ تحسین کو رہنما بنا کر ڈھونڈ لیجیے۔

"دیکھنا دیکھنا کیسے بے حیا بے غیرت لوگ ہیں۔" ایک بڈھے نے دوسرے سے کہا۔

دوسرا بولا۔ "نعوذ باللہ! روز روشن۔ چاندنی چوک کا بازار۔ گھما گھمی کا وقت نعوذ باللہ۔ استغفر اللہ۔ خدا کرے یہ لوگ مسلمان نہ ہوں۔ ورنہ میں تو جیتے جی مر مٹا۔ وضع تو بالکل پارسیوں کی سی ہے۔ ہونگے بھی وہی۔"

پہلے نے کہا "میں پرسوں انہیں دریا کے کنارے ٹہلتے بھی دیکھ چکا ہوں۔ واقعی مسلمان شریف بیبیاں ایسا کام کیوں کرنے لگیں۔ انہیں اپنے گھر سے واسطہ۔ خدا رسول کا ڈر۔ شوہر کی اطاعت اور بچوں کی پرورش مدِنظر۔ بھلا کوئی مسلمان ایسا کام کر سکتا ہے؟"

ساتھ کا ایک نوجوان گویا ہوا۔ "چچا جان سچ پوچھئے تو ہیں تو مسلمان۔ اب آپ جانیں آپ کا کام۔"

دوسرا بڈھا۔ "یہ کیونکر پتا لگا۔"

نوجوان "میں جانتا ہوں یہ اک میرٹھ کے نووارد بیرسٹر ہیں۔ جو ابھی ابھی رائے سینا میں آکر ٹھہرے ہیں۔"

پہلا بڈھا۔ "اور یہ شوخ دیدہ عورت کون تھی؟"

یہ بڈھے بھی نوجوانوں سے کیا کم ہیں ملاحظہ ہو

نوجوان۔ "ان کی بیوی۔ شوخی شرارت تو آپ سمجھیں۔ مجھے تو اک شریف زادی معلوم ہوتی ہیں۔"

بڈھا۔ "شریف زادی! کیا اے میاں شریف زادی کے معنی بھی یاد ہیں۔ کہیں شریف زادیاں بھی موٹر میں بے پردہ بازاروں کی گشت کیا کرتی ہیں۔ ایف اے پاس کر کے تمہاری عقل پر کیوں پردہ پڑ گیا۔ ابھی سے یہ حال ہے تو آئندہ کیا حشر ہوگا؟"

نوجوان۔ جناب معاف فرمایئے۔ میری عقل کے آپ کیوں پیچھے پڑ گئے خیر آپ بزرگ ہیں۔ جو کہنا ہو کہہ لیجئے۔ دیکھئے وہ موٹر کھڑی ہو گئی۔ میرے خیال میں فنچوری کے نیچے میوے والے پٹھان کی دکان کے پاس کھڑے ہیں۔"

دوسرا بڈھا۔ "چلئے چلئے ذرا دیکھیں تو۔"

پہلا بڈھا۔ "اے لو! وہ بے حیا بھی اتر پڑی۔"

نوجوان۔ "جی ہاں۔ اب لوگوں کی من مانی مرادیں پوری ہوں گی۔ دیکھئے پردہ پسند کیسے کنکھیوں سے دیکھتے ہیں!"

پہلا بڈھا۔ "دیکھیں نہ تو کیا کریں۔ اندھے ہو جائیں؟"

نوجوان۔ سود لینا دینا دونو حرام۔ رشوت لینا دینا دونوں حرام۔ پردہ نہ کرنا برا۔ پھر "پردے دار" کو دیکھنا کیوں کر بھلا ٹھہرا؟ آپ نظریں نیچی کئے گذر جائیے۔"

دوسرا بڈھا۔ "بھئی تم تو بے نماز ہو۔ تھوڑی دیر میں ہماری نماز کا وقت ہے۔ مسجد سامنے ہے۔ لو ہم جاتے ہیں۔"

یہ کہہ کر دونوں بڈھے موٹر کے پاس سے ہو کر مسجد کے دروازے پر اپنے

جوتے اتار کے اندر داخل ہونے لگے۔ دونوں بڈھوں نے نظر بھر کر خاتون کو دیکھا۔ اور ایک ایک ٹھنڈی سانس بھر کر مسجد میں قدم رکھا۔ نوجوان جلدی پاس سے گذر گیا۔ اور اس نے پہلے بھی لاہور میں بہت سی خاتونوں کو بے پردہ ٹہلتے۔ اور جلسوں میں شرکت کرتے دیکھا تھا۔

موٹر چلی تو خاتون نے کہا "مجھے اس پٹھان کی باتیں ہمیشہ بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ کہتے ہیں۔ پٹھان درشت مزاج اور اکھڑ ہیں۔ ان کی ہندوستانی گفتگو تو بہت نرم و شیریں ہوتی ہے۔ بہت (بہت ستائے رہے) بوت میٹھا ہے (میٹھا ہے)" کوئی کرخت آواز ان کے منہ سے نکلتی معلوم نہیں ہوتی۔"

جواب ملا "ڈیر۔ تم وہی بھولی بھالی قمر ہو۔ ظاہر سے دھوکا کھا جاتی ہو باطن کو نہیں سمجھتیں۔ اگر ان میں اتنی شیرینی ہوتی۔ تو انگریز کبھی کا انہیں ہضم کر چکے ہوتے (ساڑھی کی طرف دیکھکر) "بائی گاڈ" (واللہ) میرا خیال غلط تھا یہ ساڑھی واقعی خوشرنگ ہے۔"

قمر "جی آپ کے بہت سے روز خیال بھی ابھی غلط ثابت ہونے والے ہیں۔ صرف اس لئے کہ جوگی جنہیں آپ فریبی اور جاہل پکارتے ہیں۔ اس رنگ کے کپڑے پہنتے ہیں۔ آپ اس رنگ کو بُرا سمجھ بیٹھے۔ یاد رکھیئے بہت سی سادگیوں کے تحت میں خوبصورتیاں چھپی ہوئی ہیں۔"

شوہر نے ہنس کر کہا "میں ماننے کو تیار ہوں کہ بعض (سادہ) چیزیں خوبصورتی پیدا کرتی ہیں۔ خورشید سادہ سہی اور قمر خوبصورت۔ لیکن قمر کے چہرے کا حسن خورشید کے دل کی روشنی کا عکس ہے۔"

قمر "جی ہاں۔ آپ مردوں کا یہ شغلہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح اپنی برتری ثابت کرتے رہیں۔"

خورشید "میں برتر کہاں بنتا ہوں ؟ میں تو بیسیوں بار تم کو اوروں کے سامنے اپنا بیٹر ہاف (نصف بہتر) کہہ چکا ہوں"

قمر "میں اِس اشتہار بازی سے باز آئی۔ آپ کے یہ چوچلے مجھے پسند نہیں آتے۔ آگے آپ مالک ہیں"

خورشید "یہ ساری یونیورس (کائنات) یہ دنیا ہماری یہ زندگی سب اشتہار بازی تو ہے۔ بے پردگی ہے۔ وہ پردے کا زمانہ ہو چکا۔ اب ان خیالوں کو چھوڑو"

قمر "اپنی منطق تو جیسی چاہئے بگھارئیے۔ مگر اپنے علموں کو ایسے علموں سے بچائے رکھئے۔ تو بہت ممنون ہوں گی"

خورشید "(دل میں) آج کا ڈنر شاندار ہوگا۔ (قمر سے) میں نے عباس سے ٹیلیفون پر دریافت کیا تھا۔ کہ میز پر کتنے گیسٹس (مہمان) ہوں گے انہوں نے بتایا پچیس۔ تمہاری سیٹ (نشست) کرنل داس کے پاس ہے"

قمر "خدا کرے۔ آپ کا داس آپ کے چند سے بہتر ہو۔ ورنہ میرا۔ تو یہ وہی ہوگا۔ جو اس روز تھا"

خورشید "سویٹ ڈیر (عزیز ترین) اپنی متانت کو ذرا کم کرو۔ ورنہ (دائرۂ معاشرت) میں ہمارا گذارہ مشکل ہوگا"

اتنے میں موٹر میڈ نز ہوٹل کے پھاٹک میں داخل ہوئی۔ دونوں نے اپنا اپنا کوٹ سنبھالا۔ اور عباس نے ڈیوڑھی میں ہو ڈو یو ڈو (مزاج شریف) کہہ کر ان کا خیر مقدم کیا۔ اور جدید ترین مغربی طریقے پر بڑے شدومد سے مصافحہ کر کے انبساطِ ملاقات ظاہر کیا۔

---

(۲)

کھانا پینا نوع انسان کی سب سے زیادہ کمزوری ہے۔ اسی سے دنیا کے سب جھگڑے اسی سے۔ آپس کے مقابلے۔ نفس پروری۔ طمع و حرص۔ قومی جنگ و جدل ظہور میں آتے ہیں۔ اگر یہ کمزوری نہ ہوتی۔ تو انسان کبھی کا فرشتہ ہو چکا ہوتا۔ مگر ارتقا کی سواری کچھ ایسی سُست رفتار اور بے اختیار ہے۔ کہ الامان۔ قدرت کی عادت انسان کو مفت میں خراب و خستہ حال کرنا ہے۔ ٹانگیں ہوتیں۔ چلنے کے لیئے ہاتھ ہوتے کام کاج کے لیئے۔ ناک سونگھنے۔ کان سننے۔ آنکھیں دیکھنے۔ اور دماغ سوچنے کے لیئے۔ تو سب ٹھیک تھے۔ لیکن منہ غریب سے دو کام لے لیئے۔ بولنا بھی اور کھانا بھی۔ اور یہ کس کی خاطر جس کے یہ سارے دھندے دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ وحشی اور غیر مہذب قوموں پر منحصر نہیں۔ بلکہ اکثر تعلیم یافتہ تمدن یافتہ لوگ بھی اس معاملے میں حواس باختہ ثابت ہو چکے ہیں۔ ان کی سب دوڑ دھوپ ان کے سب لیکچر و کلچر ان کے سب علم و فن ان کی سائینسیں ان کے آرٹ ان کے کاروبار۔ غرض ساری کی ساری تمدنی مصروفیتیں اسی پرانے پیٹ کی خاطر۔ صرف ان لوگوں نے اس بُھتنے پر بہت سے پردے ڈال رکھے ہیں لیکن پردے اتنے باریک ہیں۔ کہ اسکی کارستانی اور بھی عُریاں ہو جاتی ہے۔ معاشرت دوستی۔ مطلب برآری سب اسی کے ذریعے اور اسی کے واسطے ہیں بعض ہندوستانی کتنے پیٹو ہوتے ہیں۔ اور انگریزوں کا تو کچھ نہ پوچھیئے۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے۔ کہ انگریز سے کام نکالنا ہو تو اُسے خوب کھلاؤ پلاؤ۔ وزیر ہند نے رشوت ستانی کی ہزار ممانعت کی۔ تحفوں کا لینا دینا۔ حاکموں محکوموں کے مابین بند کر دیا۔ لیکن یہ نہ سوجھی کہ اپنے ہموطنوں کو سیدھی راہ پر لانا ہو۔ تو ان کے کھانے بند کیئے جائیں۔

ہمارے دوست عباس بڑے زمانہ شناس اور ماہر تدن تھے۔ چند ہندوستانی بھائیوں کو بلایا اور چند انگریزوں کو بھی جن سے کچھ مطلب تھا۔ یا جو ایسی "مطلوبہ" ہستیوں کے دوستوں میں شمار ہوتے تھے۔ عباس بھی بیرسٹر تھے لیکن فقط علمی بیرسٹر تھے۔ عملی نہ تھے۔ ولایت گئے تھے۔ کیونکہ آج کل کا کوئی نوجوان جس کے باپ کی آمدنی تین سو روپیہ ماہوار سے زائد ہو اپنے باپ کو چین نہیں لینے دیتا۔ جب تک حضرت کے ساتھ اُسے سمندر پار نہ بھیجا جائے۔ انگلستان میں بیرسٹری پاس کی۔ کیونکہ اور کسی امتحان میں پاس ہونے کے وہ قابل نہ تھے۔ اس کے علاوہ لندن میں رہنا۔ شام کو پکیڈلی کے چوک میں نظارہ بازی کرنا رات کو "قانونی سرائے" قانونی طعام نوش جان فرمانا۔ جہاں انہیں کی طرح کے اور بیکار طلبا ہوتے تھے۔ اور مفت کی شراب ملتی۔ جس کے وجود نے بچارے مسلمان قاضیوں کو مفت میں بدنام کر رکھا ہے۔ ایک انگریزی قبیلے میں قیام تھا۔ جو انہیں جیسا کہ اکثر انگلستان کے رہنے والوں کا قاعدہ ہے۔ ایک ہندوستانی شہزادہ سمجھتے۔ اور ان کے فرضی مرتبے کے مطابق ان کا احترام کرتے تھے۔ ادھر انہوں نے بھی اپنا نام ایم اے کے عباس آف جہان آباد ظاہر کیا تھا۔ اس تمام شان و شوکت کے بعد تحصیل کی وہی دقیانوسی عالمگیر بیرسٹری جس کی تعریف ہمارے ایک دوست نے یہ کہہ کر کی ہے۔ کہ ڈھیلا ٹھاؤ تو نیچے سے بیرسٹر نکل پڑتا ہے۔ وطن پہنچ کر مسٹر عباس نے دو چار ماہ بیرسٹری کی تجارت کی۔ لیکن بازار سرد دیکھ کر ٹھیکیداری کی ٹھان لی۔ اور دہلی پہنچ کر رائے سینا کی مجوزہ تعمیرات کا مطالعہ کرنے لگے۔ اسی سلسلے میں یہ دعوت دی گئی۔ تاکہ حکام بالادست سے رسوخ پیدا ہو جائے۔ انجینروں اور دیگر سرکاری عاملوں کی شرح ندرانہ تو انہیں پہلے سے معلوم ہو ہی گئی تھی۔ وہ راستہ صاف تھا اور ان کی جیب بھی بڑی خالی نہ تھی۔ لیکن سیم و زر کی چمک دمک کے ساتھ اگر پیٹ کی تھوڑی سی مالش بھی ہو جائے

تو مہذب شخص کے دل و دماغ دونوں مل کر موانست اور موافقت کی راہ پر آجاتے ہیں
مہمان ایک ایک کر کے آنے لگے۔ بیس بیاہے ہوئے اور پانچ کنوارے مدعو کئے گئے تھے۔ جنٹلمین اور لیڈیاں زرق برق کے "طعامی" لباسوں میں نمودار ہوئے۔ سوائے نواب آف شاہدرہ راجہ آف تغلق آباد اور مسٹر چوہدری کے (وہ اپنے تئیں مسٹر چاوڈری کہتے تھے) باقی سب مرد انگریزی "طعامی" لباس پہنے ہوئے تھے۔ انگریزی خواتین کے لباس جدید ترین فیشن کے مطابق کٹے پھٹے تھے۔ باہیں بغلوں سمیت عریاں۔ سینہ کا حصہ عریاں اور گردن کے نیچے جسم کا پچھلا حصہ بھی اسی مناسبت سے صاف عیاں تھا۔ بھبے ہوئے اکثر جسمانی رنگ کے تھے۔ اکثروں کا سارا لباس نہایت باریک اور سُبک تھا۔ چہرے پر سفیدہ اور دو ایک کے لبوں پر سرخی بھی تھی۔ اور کان سب کے بالوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ کرنل داس جو کوئٹہ کے ایک فوجی افسر تھے بائیں آنکھ پر "مانوکل" (چشمی شیشہ) لگائے داخل ہوئے۔ مسز داس جو ایک شرمیلی تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ اپنے شوہر کے ہمراہ آئیں۔ ایک پارسی گنجے بزرگ مسٹر جمشید جی اور ان کی نوجوان صاحبزادی شیریں جمشید جی ایک نفیس موٹر کار سے اُترے۔ جس کی پشت پر ۷ ۱۳۴ BE ۔ی لکھا تھا۔ سب لوگ ہوٹل کے گول کمرے میں جمع ہو کر "گٹ بٹ" انگریزی بولنے لگے۔ تعارف میں گردنیں جھکنے اور آوازیں بلند ہونے لگیں۔ اور بے معنی گفتگوئیں ہر طرف چھڑ گئیں۔ "موسم اچھا ہے" "وائسرائے کی کھانسی پہلے سے کم ہے" "آپ کب سے یہاں مقیم ہیں" "میری گھڑی دو منٹ پیچھے ہے" ان عقلمندوں میں یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ نواب آف شاہدرہ کسی اُلّو کی مانند بڑی بڑی آنکھیں کھول کر حاضرین کا جائزہ لے رہے تھے۔ اور راجہ آف تغلق آباد کے اندر کو گھُسے ہوئے گال کسی اشوکی مینار کے کتبے کی طرح ایک عالم اثریات کے لئے موضوع تفتیش بن سکتے تھے۔

جب سب مہمان آگئے۔ تو میزبان نے لیڈی بیکن سے باادب درخواست کی۔ کہ کھانے کے لئے تشریف لے چلیں۔ وہ اپنے سبز سایہ کی دم کو سنبھالتی ہوئی کھانے کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے دیگر خواتین تھیں۔ ان کے پیچھے حکام ان کے پیچھے خطاب یافتہ لوگ اور آخیر میں عام متنفس انسان تھا۔ بس کو اس جلوس کے ترتیب دینے میں کوئی زحمت نہ اٹھانی پڑی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ اس قسم کی کارروائی کے خوگر ہیں۔ اور "آپ چلئے" "نہیں پیچھے" کہنے کی ان کو ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ ایوانِ طعام میں پہنچ کر ہر شخص نے ملاقاتی کارڈوں پر ٹائپ شدہ ناموں کا مطالعہ کرکے اپنی اپنی نشست پالی اور بیٹھ گئے۔ آٹھ "بیرے" اور تین "آبدار" کھانے پینے کی چیزیں لے کر آنے جانے لگے۔ اور میز سے انگریزی ڈنر کی شان ٹپکنے لگی۔ میز کے وسط میں مسٹر عباس تھے۔ ان کے دائیں لیڈی بیکن چیف انجینئر کی بیوی اور ان کے بائیں مسز اولڈ اسپیڈ جیجی تھیں۔ کرنل واس۔ مسز خورشید کے دائیں ہاتھ تھے۔ اور مسٹر خورشید کے بائیں طرف شیریں جمشیدجی اور ان کے بائیں طرف مسٹر چاؤدری "شنکن" تھے۔

کرنل واس نے کہا "مسز خورشید! آپ کے شوہر اور میں کیمبرج میں ایک ہی زمانے میں تعلیم پاتے رہے ہیں۔ میں نے آپ کے شوہر سے زیادہ با مذاق آدمی کم دیکھا ہے وہ اہل دنیا کو پہچانتے ہیں۔ نہایت "اپ ٹو ڈیٹ" ہیں۔

مسز خورشید۔ "صاحب! آپ کی عنایت ہے"۔

کرنل واس۔ "میرے تعلق آپ ان سے دریافت کرسکتی ہیں۔ کہ لوگوں کی میری بابت کیا رائے تھی؟" اتنے میں آبدار نمبرا دو رنگین صراحیاں اٹھائے لایا۔ اور بولا "کلیرٹ" "وسکی" کرنل نے جو گھر پر اپنے نوکروں کو گالیاں دینے میں ایک اچھا خاصہ مقرر تھا۔ کہا "نو تھینک یو" "نہیں! آپ کی عنایت" قمر نے جی میں کہا۔ میز

خیال غلط تھا۔ میں بھی لوگوں کو بغیر جانے بوجھے ان کے متعلق رائے قائم کر لیا کرتی ہوں خدا مجھے معاف کرے۔ بچارا کس قدر نیک اور کیسا حلیم الطبع۔ یہ ضرور انگلستان میں اپنا کام اچھی طرح نبا ہتا رہا ہوگا۔

کرنل داس۔ "میرے کمرے کا دروازہ ہر کہ و مہ کے لیئے کھلا رہتا تھا"

مسز خورشید۔ "(ذرا توجہ سے) انسان کو دنیا میں ایسا ہی کرنا چاہیئے۔ ہمکو اپنے پرانے طریقے کبھی ترک نہ کرنے چاہائیں"

کرنل داس۔ "ہاں اور ان کے ساتھ جو نئی باتیں بھی قابل تقلید ہوں۔ اُن کو سیکھنا چاہیئے"

اتنے میں آبدار نمبر ۲ آیا۔ اور کہا "حضور شیمپین" کرنل نے اپنے جام میں ڈالنے کا اشارہ کیا۔ پھر مسز خورشید سے کہا۔ نوش جان فرمائیے۔ اس نے ذرا چیں بجبیں ہو کر کہا۔ "مجھے معاف فرمائیے"

کرنل داس۔ "ہاں ہاں میں ہی بھول گیا۔ آپ کے مذہب میں بہت سے لوگ اسے ناجائز سمجھتے ہیں۔

مسز خورشید۔ "ہمارا مذہب خود اسے ناجائز اور ممنوع قرار دیتا ہے۔ بہت سے لوگوں سے آپ کا کیا مطلب ہے

کرنل داس۔ "ہندوستان میں ہمارے بعض بعض مسلمان بھائی جو تعلیم پا چکے ہیں۔ تھوڑی بہت پیتے ہیں۔ اور خاص اسلامی ملکوں میں تو اب اسکا خاصا رواج ہو چلا ہے۔ (مسکرا کر) میں سنتا ہوں۔ کہ آپ کے بعض ترکی رہنماؤں کے ہونٹ بھی مغربی شرابوں سے لال ہوتے ہیں۔ (آبدار نے تھوڑی سی اور شراب ڈالدی)

مسز خورشید۔ "جناب اسلام ترکیت یا ایرانیت یا عربیت یا ہندیت نہیں ہے"

کرنل داس۔ لیکن مجھے یہ پوچھنے کی اجازت دیجیئے کہ آخر تھوڑی سی پینے

میں ہرج کیا ہے۔ طاقت کے لیے ناچنے کے لئے مل کر بیٹھنے مل کر باتیں کرنے کے لئے ذرا سی پی لی۔ تو گویا آسمان ٹوٹ پڑا۔ جیسے اور بیٹھنے کی چیزیں ہیں۔ ویسی ہی یہ بھی ہے

مسز خورشید۔ "جی ہاں طاقت کے لئے اور مل بیٹھنے اور بات چیت کرنے کی ہی تو اک ترکیب ہے۔

کرنل وال "یہ سمجھ کر کہ لیڈی سے زیادہ بحثنا تہذیب حاضرہ کے منافی ہے" میں ماننے کو تیار ہوں۔ کہ ہر شخص کو اپنے مذہب پر قائم رہنے کا حق ہے۔ یہی تو موجودہ تمدن کی خوبی ہے۔ کہ اس میں کسی امر کی مجبوری نہیں۔ جو جس کے جی میں آئے کرے۔ مجھے یہ بہت پسند ہے۔

گفتگو کا سلسلہ ذرا ٹوٹا تو مسز خورشید کے بائیں ہاتھ مسٹر اولڈ ہسبینڈ نے کہا۔ مجھے دہلی کا موسم سرما بہت پسند ہے۔ قدسیہ باغ میں شام کو ٹینس کا کتنا لطف ہوتا ہے میں نے آپ کو بھی وہاں کھیلتے دیکھا ہے۔

مسز خورشید۔ "ہاں میں کبھی کبھی کھیلا کرتی ہوں۔ مجھے یہ انگریزی کھیل بہت پسند ہے۔ کھلی ہوا میں باغ میں ورزش کرنا عورتوں کے نصیب میں نہیں۔ اے کاش ہندستانی اس معاملے میں ذرا فراخدلی سے کام لیں۔

مسٹر اولڈ ہسبینڈ "جب تک ہندوستانی لوگ متمدن ہو کر آزاد خیالی سے زندگی بسر نہ کرینگے۔ ترقی نہ کر سکینگے۔ وحشیانہ رسوم کو چھوڑ دینا چاہیے۔

مسز خورشید۔ "اپنے پرانے خیال کے لوگوں کو میں وحشی تو کبھی نہ کہوں گی اور بعض آزاد خیالوں سے بھی ہم پیچھے ہی رہیں۔ تو بہتر ہے۔ لیکن آپ یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ بعض رسوم نے ہماری قومی زندگی کو دبا رکھا ہے۔

مسٹر اولڈ ہسبینڈ۔ "آپ سی روشن خیال خاتونیں ہی نئی روشنی کا نمونہ بن سکتی ہیں۔ اگر اسی طرح آپ کی بہت سی بہنیں انگریزی تعلیم پائیں۔ تو آپ سے کے

گھروں سے قدامت پسندی کا قدم اٹھ جائے۔

مسٹر خورشید۔ "ہماری ترقی کا مسئلہ میرے خیال میں صرف مغرب کی تقلید سے حل نہیں ہو سکتا۔ لیکن مغرب سے ہمیں بہت کچھ سیکھنا ضرور ہے۔ آپ کی سی مشغولیت آپ کا سا استقلال آپ کی سی قومی محبت میں اپنے وطن میں نہیں دیکھتی۔ میز کے دوسرے کونے کی طرف فضا اتنی سنجیدہ و متین نہ تھی۔ ہاں سے ہنسی کی آوازیں اور قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ مسٹر خورشید مس رستم جی کی باتوں میں منہمک معلوم ہوتے تھے۔

مس جمشید جی۔ "میں کل وائسرائے کے ہاں کھانے پر گئی۔ لیڈیوں کا لباس انتہا درجہ شاندار تھا۔ میری ساری کی وہاں بڑی تعریفیں ہوئیں۔

مسٹر خورشید۔ "آج بھی تو آپ کی ساری نہایت خوب صورت ہے۔"

مس جمشید جی۔ "اگر وہ کل والی ساری میں آج پہنے ہوتی۔ تو آپ کی نظر میرے سوا کسی اور پر نہ پڑتی۔" (قہقہہ لگایا)

مسٹر چودھری (مسٹر خورشید سے سنجیدگی کے ساتھ۔) "گویا مس رستم جی کو شکایت ہے۔ کہ آپ نے اپنی بے توجہی سے ان کی ہتک کی ہے۔"

خورشید۔ "معاف فرمایئے۔ اگر میں نے آداب مجلس کی خلاف ورزی کی ہے"

مس جمشید جی۔ "نہیں نہیں یہ تو آپ کو بناتے ہیں۔ میں آپ سے خفا نہیں (ہنس کر) اور نہ ان سے ناراض ہوں۔"

مسٹر چودھری۔ "آپ کے خاندان کے متعلق مس رستم جی میں نے بہت ہی دل خوش کن باتیں سنی ہیں۔"

خورشید۔ "آپ بہ نفس نفیس اپنے خاندان کا آئینہ ہیں۔"

مس جمشید جی۔ "آج کل زندگی کافی لطف سے نہیں گذرتی۔ گذشتہ

سال میں پیرس کی سیر کو گئی۔ میری ایک عزیزہ بھی میرے ہمراہ تھی۔ وہ پتلی دبلی بچاری تو سوئٹزرلینڈ کی ایک صحت گاہ میں صحت حاصل کرنے کو چلی گئی۔ میں اپنے والدین کے ہمراہ پیرس اور لندن میں مقیم رہی۔ کیا کہوں جو کچھ دیکھا حسن و نقاشی کے بہترین چلتے پھرتے نمونے جو میں نے پیرس میں دیکھے ہیں۔ کہیں نظر نہیں آسکتے۔ وہ مولاں روژ (سرخ چکی) کی رنگ آفرینیاں وہ اوپرا (راگ گھر) موسیقی وہ شانِ زلیزی کی شان و دلاویزی مجھے نہیں بھولتی پر نہیں بھولتی۔ اس گلستان کی سیر کے بعد اگر اس کیچڑ میں پھنس جانا غضب ہے۔ میری زندگی تو سخت بے لطف ہے۔"

مسز چودھری۔ "خدا نہ کرے! آپ مغموم تو نہیں رہتیں۔ آپ کو کوئی فکر تو نہیں؟"

مِس جمشید جی۔ "غم کے سر سینگ نہیں ہوتے۔ فکر کسی بت کا نام نہیں جو انسان خریدنے جائے۔ لیکن جب روزانہ زندگی میں لطف و مسرت کے سامان نہ ہوں۔ تو زندگی زندگی نہیں رہتی۔ بمبئی میں خیر بہت سے کلب ہیں۔ ہفتے میں پانچ دفعہ میں اپنے کلب میں روز دو چار گھنٹے تاش کھیلتی ہوں۔ ایک آدھ گھنٹہ ٹینس کھیلتی ہوں۔ ہر روز کہیں نہ کہیں چائے یا کھانے پر جانا ہوتا ہے۔ پیر اور بدھ اور ہفتے کے روز عموماً تھیئٹر یا سینما سب اکٹھے جاتے ہیں۔ یا کبھی کوئی دوست تماشے پر لے جاتا ہے۔ لیکن خدا بچائے۔ یہ دہلی تو فراغت کا جہنم ہے۔ نہ کام نہ کاج صرف ایک دفعہ ہفتے میں سینما دوسری دفعہ جاؤ۔ تو وہی تصویریں۔ بمشکل ہفتے میں ایک بار ناچ۔ کبھی کبھی کوئی ــــ (ملاقات) ہوتی ہے۔" اتنے میں مسٹر عباس نے اُٹھ کر کہا۔ لیڈیز اینڈ جنٹلمین (پھر اپنے شراب کے گلاس کو بلند کر کے کہا۔) "ہز میجسٹی دی کنگ!" سب نے

کھڑے ہو کر کہا۔ "دی کنگ" بعض ہندوستانیوں نے کچھ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا کسی نے سچ مچ کسی نے جھوٹ موٹ جام صحت نوش فرمایا۔

مسٹر چودھری (مس رستم جی کے جواب میں) "مجھے افسوس ہے کہ آپ کے دن یوں ہی دلچسپی سے خالی ہیں۔ واقعی ہم کلکتے بمبئی والوں کے لیے شمالی ہند کے یہ شہر بیابان کا نمونہ ہیں۔ میں آپ سے قطعی طور پر اتفاق کرتا ہوں۔ لیکن میرے خیال میں ہم جنٹلمینوں کا فرض ہے۔ کہ آپ جیسی روشن ضمیر لیڈیوں کے لیے دلچسپی کا سامان بہم پہنچائیں"

مس جمشید جی۔ (خورشید کی طرف کنکھیوں سے دیکھ کر) تو یہ آپ لوگوں کا فرض ہے۔ کہ ہم بدیسیوں کی مدد کریں"

شیریں جمشید جی نہایت حسین اور خوش وضع خاتون تھی۔ اسکا انداز گفتگو اس کی جادو بھری نگاہ اسکے غلط انداز غمزے جس پسند نوجوانوں کے دل پر تیر و نشتر کی بارش کرتے تھے۔ شیریں کو بنگالی کے پاماں سیاست چہرے میں ذرا دلکشی نظر نہ آئی لیکن خورشید پر اسکا دل پسیجا۔ باوجودیکہ بنگالی ابھی کنوارا اور پنجابی بیاہا ہوا تھا لیکن ان حالات کی شیریں کو کیا پروا تھی۔ دور اندیشی اکثر حسن کا وصف نہیں ہوتا اور لگاوٹ کا تو نام ہی ناعاقبت اندیشی ہے۔

خورشید۔ "نکیل لیکن حسن و مسرت کے لئے ذرا کمزور دل واقع ہوا تھا۔ اس کا دل اس ٹھیس سے زخمی ہو گیا۔ کہ ایسی حسین لڑکی غربت میں اکیلی اور بے یار و مددگار ہو۔ ذرا تامل کے بعد جواب دیا" ہم کبھی گوارا نہیں کر سکتے کہ آپ کو تکلیف ہو"

مس جمشید جی۔ "رنج و تکلیف کے ذکر سے مجھے نفرت ہے۔ ہاں کہیے۔ آپ "برج" (تاش کا ایک کھیل) کھیلتے ہیں؟"

خورشید۔ "بے شک میرے ہندو دوستوں نے میرا نام برج نرائن رکھا ہے

مس جمشید جی۔ "تو اپنے میزبان سے اجازت لے کر کھانے کے بعد ہم برج کھیلیں گے۔"

مسٹر چودھری۔ "لیکن آج کھانے کے بعد یہاں ناچ ہے۔"

مس جمشید جی۔ "اہا! مسٹر خورشید کیا آپ ناچتے ہیں؟"

نواب شاید وہ جو بالمقابل بیٹھے تھے۔ ناچ کا نام سن کر بدکے۔ اور نعوذ باللہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔ مسز داس سمجھیں کھانے میں کوئی خرابی ہے۔ لیکن نہیں لیکن سمجھیں۔ نواب صاحب ان سے مخاطب ہونا چاہتے ہیں۔ کہا

(کیا ارشاد ہوا؟) نواب صاحب چیخ اٹھے۔ "لیڈی صاحبہ" لیڈی صاحبہ حیران سی رہ گئیں کہ کیا ماجرا ہے؟

مسٹر خورشید (مس جمشید جی سے) نہیں میں ناچتا نہیں۔ ہمارے خاندان میں یہ بات بہت معیوب سمجھی جاتی ہے۔"

مس جمشید جی۔ "لیکن آپ کا خاندان تو ہندوستان ہی میں ہوگا۔ آپ لنڈن پیرس میں کبھی نہیں ناچے؟"

مسٹر خورشید۔ "اب تو میں کبھی نہیں ناچتا۔"

مس جمشید جی۔ (یہ دیکھ کر کہ وہ رضامند نہیں) اچھا تو ہم تاش کھیلیں گے۔ مجھے بھی آج ناچنے کی خواہش نہیں۔ دس روپے فی صدی کھیلیں گے۔ مسٹر چودھری خلوت کا یہ رنگ دیکھ کر جلوت سے الگ ہو گئے۔ اور مسز داس سے باتیں کرنے لگے۔

اتنے میں کھانا ختم ہوا۔ پہلے لیڈیاں اٹھیں اور گول کمرے میں جا کر آپس میں نسوانی سی باتیں کرنے لگیں۔ مسز داس اور مسز خورشید بہت جلد ایک دوسرے سے بے تکلف ہو گئیں۔ اور ایک دوسرے سے اکثر ملتے رہنے کی ٹھان لی۔

مرد کھانے کی میز کے گرد بیٹھے سیگرٹ سگار اور شرابیں پیتے رہے۔ آدھ گھنٹے کے بعد سب لوگ ناچ کمرے میں جمع ہوئے۔ ناچنے والے اور ناچنے والیاں اپنے اپنے "ناچ کا غذ" سنبھالے ایک دوسرے سے پوچھ پوچھ کر اپنا تقسیم اوقات بنا رہے تھے۔ نہ ناچ سکنے والے کمرے کے گرداگرد کرسیاں بچھائے نظارۂ رقص کا انتظار کرنے لگے مس رستم جی اور خورشید اور دو اور کھلاڑی میزبان کی اجازت لے کر ساتھ کے کمرے میں تاش میں منہمک ہو گئے۔ مسز خورشید گھبرائی ہوئی ادھر اُدھر اپنے خاوند کو ڈھونڈ رہی تھی۔ کہ مسز داس نے پاس آکر کہا۔ معاف کیجئے آپکو کیا تشویش ہے؟ انہوں نے سوال کیا میرا شوہر؟ جواب ملا۔ وہ تاش کمرے میں تاش کھیل رہے ہیں۔ گھبراؤ مت میں ذمہ وار ہوں۔ مسز خورشید مسکرائیں۔ اور پھر باتوں میں لگ گئیں۔

(۳)

موٹر میں سوار ہو کر اپنی کوٹھی کو چلے۔ تو خورشید نے کہا "کس قدر نفیس کھانا اور کیسے اچھے لوگ تھے" قمر نے کہا "اچھے بُرے کی صحیح پہچان تو خدا ہی کو ہے۔ لیکن ان کی سب باتیں تو اچھی نہ تھیں۔ جُوا کھیلنا شریفوں کی عادت میں داخل نہیں۔ قمر کچھ دیر سے پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ جو جی میں تھا۔ آخر کہہ ہی دیا۔ اُسے شوہر سے محبت تھی اور شوہر نے اسے آزادی بھی دے رکھی تھی۔ سو اس کا ارادہ تھا۔ کہ کسی بات کو شوہر سے چھپائے نہیں۔ بلکہ اس کی طرف سے دل میں جو میل ہو۔ اس پر صاف صاف ظاہر کر دے۔ خورشید آزاد خیال تھا۔ عورتوں کی عزت کرتا تھا۔ نئے مغربی طریقوں کو پسند کرتا تھا۔ لیکن اس بات کو نہ سمجھ سکتا تھا کہ کوئی عورت کیوں کر بندش کے خیالوں کو خود ہی پسند کرے۔ کیوں آزادی اور نشاطِ زندگی کی طرف خود بخود مائل نہ ہو؟ وہ کہتا تھا۔ کہ ہمیں ہندوستانی عورتوں کو

تربیت دینا آزادی کی سیدھی راہ پر لانا اور تمدن باتیں سکھانا ہے ان کے دائرے کو وسیع تر کرنا۔ ان کے نقطۂ نظر کو درست کرنا ہے۔ اور ان کے جی سے اس بات کو مٹانا ہے۔ کہ مردوں کے سامنے آنکھ اٹھانا بے حیائی اور ان سے بات تک کرنا گناہ کبیرہ ہے۔ قمر تعلیم یافتہ تھی۔ نئی تعلیم اس پر اثر کر چکی تھی۔ لیکن اسلامی وسندی تمدن کا خمیر اس کی فطرت میں ہنوز موجود تھا۔ قدم بڑھاتی تھی۔ لیکن قدم قدم پر سوچتی تھی کہ میں کدھر جا رہی ہوں۔ شوہر کی مرضی پر چلنا ضروری سمجھتی تھی۔ لیکن جہاں وہ غلطی پر ہوتا۔ اس آزادی کی بنا پر جو اسے حاصل تھی۔ شوہر کو ٹوک بھی دیا کرتی۔

لیکن آج کی رات کچھ ایسی رات تھی۔ کہ بیوی کی روک ٹوک خورشید کو بری معلوم ہوئی۔ وہ کچھ عرصے سے قمر کو دیکھ رہا تھا۔ کہ وہ بجائے قدم آگے کو بڑھانے کے پیچھے کو ہٹ رہی ہے۔ اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ نئی معاشرت سے وہ بعض اوقات متنفر نظر آتی ہے۔ اس سے وہ دل میں ناراض تھا۔ لیکن جلد کوئی ایسا منصوبہ نہ باندھ سکتا تھا۔ جو قمر کو جدید رستے پر لے آئے۔ آج اسے موقع ملا۔ اس نے ذرا جھنجلا کر کہا۔ "قمر تم ہر بات میں ہر شخص سے بدگمانی رکھتی ہو۔ نہیں معلوم یہ مشرقی عادت تم نے اپنے نانا سے سیکھی ہے۔ وہ خود عورتوں کو کنکھیوں سے دیکھنے میں مشتاق تھے۔ اور شاید اسی لئے جب کسی عورت کو گھر کی چار دیواری سے باہر دیکھتے تو فوراً کہہ اٹھتے ہو نہ ہو یہ بدچلن ہے۔"

قمر۔ "معاف فرمائیے۔ میرے نانا جان اس وقت آپ سے لڑ جھگڑ نہیں رہے ہے۔"

خورشید۔ تم جو اپنے نانا کی نمائندہ یہاں موجود ہو۔ جسے تم جوا کھیلنا کہتی ہو وہ محض ایک معصوم کھیل ہے۔ بھلا ذرا سوچو تو سہی کہ اگر تاش میں میں نے چار روپے جیت لیے یا ہار دیئے تو کیا آفت آ گئی۔ میری نیت قمار بازی کی نہیں۔ میں دن بھر اپنا وقت اسی میں ضائع نہیں کرتا۔

قمر:- اسی طرح شراب پی لینا اور ناچنا بھی کیا بُرا ہے؟ ساری رات شراب کون پیتا ہے۔ پھر وہ کون ناچتا رہتا ہے؟

خورشید۔ (غصے میں) "مجھے معلوم نہ تھا۔ کہ باوجود تعلیم کے تم اس قدر ذلیل خیال ہو۔ میری زندگی خراب ہو جائیگی

اور اس کا باعث صرف تم ہوگی۔"

مرد عورتوں کو قول و فعل کی آزادی دینے کے مدعی ہیں۔ کم از کم مشرق میں اپنے دعوے کے ثبوت میں اکثر اپنے عملوں کو پیش نہیں کر سکتے۔ بعض باتوں میں نئے تعلیم یافتہ روشن خیال ہوں لیکن ابھی مردانہ حکومت کی بو ان سب کے دماغ سے نہیں گئی۔ خورشید کے الفاظ سے زیادہ اسکے بشرے نے قمر کو خاموش کر دیا۔ وہ تاڑ گئی کہ خورشید کا میلانِ طبع کس طرف کو ہے۔ دونوں موٹر میں خاموش رہے اور اسی طرح گھر پہنچے۔ خورشید بجائے قمر سے الگ دوسرے کمرے میں سونے کو چلا گیا۔ دونوں اپنے اپنے کمرے میں اپنے اپنے بستر پر لیٹے رہے۔ اس تشویش و خفگی میں نیند کسے آتی۔ تین چار گھڑی دونوں کروٹیں بدلتے رہے۔

خورشید جی میں کہہ رہا تھا۔ "میں نے ایسی عورت کبھی نہیں دیکھی۔ صدیوں سے مشرقی عورتیں یہ رونا روتی آئی ہیں۔ کہ مرد ہم پر ظلم و تعدی کرتے ہیں۔ اپنے آپ کو ہمارا حاکم سمجھتے ہیں۔ جو جی میں آتا ہے کرتے ہیں۔ جو جی میں آتا ہے کہتے ہیں۔ ہماری نہیں سنتے۔ اپنی ہانکتے ہیں۔ عورت چار دیواری میں مقید ہے۔ سورج کی جتنی روشنی۔ فضا کی جتنی ہوا۔ دیواروں کے اوپر سے اندر کو آ سکے۔ وہی اسکا نصیب۔ بچے جننا اسکا کام۔ نوکرانیوں سے لڑنا اسکا مشغلہ۔ کمروں کی صفائی۔ گیہوں چاول کی خرید۔ پیاز لہسن کا بیوپار۔ دھوبن پنہاری کے جھگڑے یہ اسکے انتظام۔ جاہل اور قیدی کا اسکو خطاب دیا جاتا ہے۔ پھر اگر

چند ابتدائی کتابوں سے زیادہ پڑھنے لگے۔ تو اس پر آوازے کسے جاتے ہیں۔ اس کی کمزوری اور نا تجربہ کاری کی پھبتی اڑائی جاتی ہے۔ ساتھ ہی اندھیری کوٹھڑیوں کی بند ہوا میں اسے رکھا جاتا ہے۔ اور گھر کی دیواریں ہی اس کی زندگی کا افق ہیں۔ یعنی بلبل کو پنجرے میں قید کر کے صیاد بڑی ہمدردی سے چلاتا ہے کہ نا سمجھ تو اڑ نہیں سکتی۔ ہندوؤں نے عورتوں کی جو گت بنائی وہ ظاہر ہے۔ کیا ستی کیا بیوگی کیا مال و متاع سے محرومی اس کی بری حالت ہے۔ اس کے اولاد ہوئی تو خاوند کے بعد اپنے لڑکوں کی دست نگر اور نہ ہوئی تو دونوں جہان میں اسکا منہ کالا۔ اسلام نے عورت کو حقوق دیئے۔ مگر مسلمانوں کی عقل پر پردہ پڑ گیا۔ پنجاب والے تو نہ صرف دستور کے پابند ہو کر اُسے جائداد سے محروم رکھتے ہیں اور ستم یہ کہ اسکے منہ پر جہالت کے پردے ڈال کر اسے اونچی اونچی دیواروں والے قید خانوں میں مقید رکھتے ہیں۔ اب وہ کرے تو کیا کرے اور کہے تو کس سے کہ عورت بے غیرت ہو گئی کبھی باہر نکلی اور حضرت کو شرم آنے لگی۔ اس سے تو ان کے کتے بھی زیادہ آزاد ہیں۔ کہ آسمان کی ہوا روشنی سے تو لطف اٹھاتے ہیں۔ اسی ظلم و ستم کو ہمیں کم کرنا ہے۔ اس سوتی ہوئی دنیا کو نئی روشنی کی چمک سے جگانا۔ منجمد سوسائٹی کو امنگوں کی حرارت سے گرمانا ہے۔ مغرب کی مثال ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔ ترقی یافتہ قوموں کے قدم بقدم چل کر ہی ترقی ممکن ہے۔ اسی طرح موجودہ دنیا میں نشوونما ہوگی۔ اسی طرح بیدار مغرب قوموں کا مقابلہ ہوگا۔ لازم ہے کہ ہم اپنی مقید عورتوں کو آزاد کریں۔ لازم ہے کہ ہم ان کو آزاد خیالی کی راہ پر لگائیں۔ لازم ہے کہ وہ مہذب سوسائٹی میں مہذب لوگوں کی سی باتیں سیکھیں۔ ان کے بجائے قمر قدامت کے گلے کا ہار ہو رہی ہے۔ اُسے نئی باتوں سے گھن آتی ہے۔ وہ آبائی پارسائی کی مشتاق ہے۔ تارک الدنیا ہونا چاہتی ہے۔ میں نے اُسے تعلیم یافتہ سمجھ کر

شریک زندگی بنایا۔ اب بجائے اسکے کہ وہ اپنی زندگی کو درست کرے الٹی میری زندگی کو ذلیل کرنے کے درپے ہے۔ کیا میں گھر میں قید ہو کر بیٹھ رہوں؟ کسی پارٹی میں جاؤں تو تاش کھیلنے سے انکار کردوں؟ ناچ کا نام سن کر ناک بھوں چڑھاؤں؟ شراب کو دیکھتے ہی لاحول ولا کہنا شروع کردوں۔ آخر تاش میں کیا نقص ہے۔؟ ناچ میں کیا گناہ ہے۔ شراب میں کیا کفر ہے؟ میں جوا باز نہیں طوائف نہیں بادہ پرست نہیں۔ پھر چند آنے مارنے جیتنے میں۔ اعضا موسیقی کے ساتھ ہلانے جلانے میں کسی اور کھانے پینے کی شئے کی طرح انگور کا ست چکھ لینے میں میں نہیں جانتا کیا اخلاقی جرم ہے؟ ہم ہندوستانیوں کی فطرت انتہا پسند ہے۔ یا ہم شراب میں مستغرق عورت میں منہمک اسراف وعشرت میں مصروف ہیں۔ یا لمبی داڑھی کئے بدن پر راکھ ملے تسبیح لٹکائے سر دھن رہے ہیں۔ میں تو چاہتا ہوں۔ ہم سب کچھ کریں۔ ہاں ذرا اعتدال سے۔ یوروپ والے اگر عیش وعشرت میں منہمک ہوتے۔ تو اب تک برباد ہو چکے ہوتے۔ اور ہم اگر خدا کے بڑے پیارے ہوتے۔ تو یوں ذلیل وخوار نہ ہوتے۔ نہ ان میں اتنے نقص ہوتے۔ نہ ہم میں اتنی خوبیاں۔ میں قمر کے قید وبند سے اپنی جان کو عذاب میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ اگر وہ سب نئی چیزوں سے احتراز کرنا چاہتی ہے۔ تو کیا کرے۔ میں تو وہ کروں گا جو میرے جی میں آئے۔

یہ تھے خورشید کے خیالات۔ اُدھر قمر اپنے خیالوں میں غرق تھی۔ وہ سوچتی تھی کہ میں نے خورشید کے کہنے پر اپنے خیالوں کو بدلا۔ جو باپ دادا نے سکھایا تھا بہت کچھ بھلایا۔ باپ نے اچھی تعلیم دی ہی تھی۔ گرلز کالج کے دن میری زندگی کا جزو بن گئے۔ مجھے کچھ پرانے خیالوں سے محبت نہیں۔ میں نے پردہ چھوڑا۔ خلوت کا رواج توڑا۔ کہ عورت کی دست نگری اور غلامی مجھے پسند ہی نہیں۔ خدا نے شوہر میں ترقی پسند آزاد خیال دیا۔ شکر ہے کہ میں گھر کی چار دیواری میں مقید

نہیں۔کسی پرانی وضع کی ساس کے دن رات کے طعنوں سے مجھے بچاؤ ہے۔
صرف بچّوں۔ نوکروں اور مچھّروں مکھیوں سے واسطہ نہیں۔ بلکہ خدا کی روشنی اور
ہوا کی نعمتیں بھی مجھے میسّر ہیں۔ پردہ اچھی شئے ہے۔ مگر بدن کا پردہ نہ کہ آنکھ منہ کا
پردہ۔ قرآن مجید کی تعلیم کے معنے میں تو یہ سمجھتی ہوں۔کہ اپنے بدن کو چھپائے رہو
سوائے ان حصّوں کے جو چار و ناچار کھلے رہیں۔ آنکھ دیکھنے کے لئے ہے۔ منہ
کھانے اور بات چیت کرنے کے لئے۔ ناک سونگھنے اور سانس لینے کے لئے۔
تو کیا یہ چار و ناچار نہیں کھلے رہتے؟ انگریزوں اور بعض ہند و مسلمان خاتونوں کا
ننگی باہیں اور ننگا سینہ رکھنا مجھے سخت ناپسند ہے۔ نہ اُس کی کچھ ضرورت ہے۔
نہ یہ مناسب ہی ہے۔ کہ عورتیں اپنے جسم کے زیادہ سے زیادہ حصّے کی نمائش
کریں۔ لیکن کسی کاٹنے والے جانور یا مسخ شدہ انسان کی طرح یہ بھی کیا ضرور ہے
کہ چہرے پر ایک پٹّی یا ٹپکا ہی باندھ کر عورت کو گھر کے پنجرے سے باہر نکالا جائے
میرے لئے خدا کی سب سے بڑی نعمتیں تازہ ہوا۔ سورج کی روشنی۔ چاندکی
چاندنی کھلے میدان شگفتہ باغ ہیں۔ جو کوہستان صحرا۔ ندی نالے اور بحر و بر
اس نے بنائے۔ انہیں مرد دیکھے تو عورت نے کیا جرم کیا ہے کہ وہ نہ دیکھے
پھر دنیا کے سب مرد ہمارے بھائی اور سب عورتیں ہماری بہنیں نہیں کہ ہم ان
سے نہ ملیں جلیں؟ کیا سب مرد بُرے ہی ہیں کہ ان سے دور بھاگنا لازم ہو
اور کیا سب عورتیں کمزور دل ہی ہیں۔ کہ مرد کے سامنے گئیں اور موم ہو کر لگیں پگھلنے۔
خدا کو منظور ہے تو میں اپنی زندگی کو اپنی ہندوستانی بہنوں کی آزادی کے لئے
وقف کر دوں گی۔ گھر سے باہر نکلنا۔ چلنا پھرنا۔ آنا جانا مجلسی آداب کے ساتھ مردوں،
عورتوں سے ملنا جلنا۔ کسی کی سُننا۔ اپنے جی کی کہنا۔ یہ سب کچھ ہو۔ اور خود داری۔
متانت۔ حیا داری۔ آزادی یہ ہم عورتوں کی زندگی کے چار عنصر ہوں۔ لیکن خورشید

کہتے ہیں کہ میں میم بن جاؤں۔ جو میمیں کریں وہ میں کروں۔ مردوں سے ہنسوں۔ کھیلوں۔ جوا۔ شراب۔ ناچ ان کو برا نہ کہوں۔ اور شاید ایک وہ دن بھی آجائے۔ کہ وہ چاہیں میں ان باتوں میں حصہ لوں۔ خدا کی قسم جس نے مجھے اپنے ایمان پر قائم رکھا ہے۔ مجھ سے مغرب کی قطعی تقلید کبھی نہ ہوگی۔ جیسے مجھ سے مشرق کی غلامی بھی نہ کی جائے گی۔ خدا کرے ہم ہندوستانی عورتیں آزادی سے چلیں پھریں۔ آزادی سے بولیں۔ آزادی سے رہیں۔ مگر خدا کرے کہ ہمارے دماغ میں خبط نہ سمائے۔ کہ بزرگوں کا ادب ہمارے دل سے اٹھ جائے محض اس لئے کہ وہ غریب بزرگ مردوں کی جنس سے ہیں۔ ہم عریاں لباس متحرک جسم رنگین جام و صراحی کے لئے للچانے لگیں۔ ہر شام کو کلب میں جوا۔ ہر رات کو ناچ گھر میں رقص اور ہر کھانے پر پینے کے لئے شراب گرما گرم ہو۔ ناز و ادا ہماری گفتگو کو زیر و زبر کریں۔ ہم تب ہی خوش ہوں۔ کہ کوئی مرد ہمارے حسنِ لباس حسنِ خرام یا حسنِ رخ و زلف کی تعریف کرے۔ خدا کرے ہندوستان کی سوسائٹی ان مخربات سے پاک و صاف رہے۔ خدا کرے ہم باہر نکل کر اپنی قومی و ملی ترقی اور انسانی تہذیب و تمدن کی حصہ دار بنیں۔ لیکن نہ ہو۔ کہ جب تک ہفتے میں دو بار تھیٹر اور مہینے میں دس وقت مغربی دعوتیں نہ ہوں۔ دنیا میں ہمارا جی ہی نہ لگے۔ بیرونی زندگی میں اسکی معاشرت میں اسکی سیاست میں ہم حصہ لیں۔ لیکن اتنا کہ گھر بار کی مصروفیتوں سے بے تعلق نہ ہو جائیں۔ اور قرابت داریوں اور عزیزانہ محبتوں سے بے اعتنائی نہ برتنے لگیں۔ میں چاہتی ہوں۔ کہ مشرقی زندگی کے گھر کی ہمدردی و محبت معاشرتی دنیا کی فضا پر چھا جائے جس سے انفرادی و اجتماعی زندگی کا ایک خوشگوار امتزاج پیدا ہو۔ اور دنیا مردوں عورتوں کے لئے ایک جنت بن جائے۔ خورشید پر میرا زور نہیں۔ یہ یوں ہو کہ وہ مجھے مجبور کرے۔ خدا کرے ہم دونوں کی زندگی ہمخیالی

کے سانچے میں ڈھل جائے۔ لیکن اگر خورشید کو یہی منظور ہے کہ وہ مغربی تجربات میں حصّہ لے۔ خواہ اعتدال ہی کے ساتھ۔ تو مَیں بالکل چُپ سادھ لونگی۔ میری تمنا ہے۔ کہ مغربی بغاوت کا جوش میرے دل میں نہ ہو۔ لیکن اِدھر مشرقی خود داری مجھے راہِ راست سے نہ ٹلنے دے۔ میرا شوہر بڑا بھٹکے۔ لیکن اس کے بھٹکنے سے میں نہ بہک جاؤں گی۔ نہ اسکی مغربی افراط پر میں مشرقی تفریط کی پھر سے مشتاق ہونے لگی ہوں۔ پیارے خورشید! ایسا نہ کرو کہ مَیں مایوس ہو جاؤں۔ تمہاری خوشی میرے سر آنکھوں پر۔ لیکن پیارے یہ بیرونی آزادیاں ہماری باہمی خوشیوں کے لئے جو تمہیں اب بھی دل سے پیاری ہیں۔ زہر قاتل ہیں۔ خدایا ہمیں توفیق دے کہ ہم نیک راہ پر چلیں۔ اور ہماری محبتوں کو ہمیشہ ہمیشہ قائم رکھ۔

(۴)

خورشید قابل نوجوان تھا۔ ہندوستانیوں سے انگریزوں سے اسکا میل جول تھا۔ اپنے کام میں اسے مہارت تھی۔ اور بیرسٹر تو آٹھ آٹھ دس دس برس سے ابھی دلالی کے سہارے گذارہ کرتے تھے۔ لیکن یہ اچھی خاصی ایمانداری کے ساتھ اڑھائی تین ہی برس میں ہوشیار بیرسٹروں میں شمار ہونے لگا۔ وکالت کے ساتھ ساتھ اس نے سیاسی زندگی میں بھی قدم رکھا۔ اور لیجسلیٹو اسمبلی کا ممبر منتخب ہو کر انڈی پینڈنٹ (آزاد خیال) جماعت میں شامل ہوا۔ اسمبلی میں اس نے چند عمدہ تقریریں کیں۔ اور ان کے دوران میں بار بار اس بات پر زور دیا کہ ہندوستان کے سیاسی جھگڑے اب بھی ایک حد تک انگریزوں ہندوستانیوں کے مابین اچھے تعلقات قائم کرنے سے کم ہو سکتے ہیں۔ اِس نے عدم تعاون کی مخالفت کی لیکن یہ کیا کہ یہ تحریک نتیجہ ہے۔ انگریزوں کی شہنشاہیت اور تکبّر و تحوت کا۔ ہندوستانیوں کا نصب العین ہندوستان کی آزادی ہونا چاہئے۔ لیکن موجودہ

حالت میں ہندوستان کا انگلستان سے قطعی بے تعلق ہو جانا عملی سیاست کے بس کی بات نہیں۔ لہذا ہندوستان کے لئے بہتر یہی ہے کہ انگلستان کی سلطنت کے اندر رہ کر زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل کرنے کی پوری کوشش کرے۔ اور انگلستان کا اخلاقی فرض ہے۔ کہ سیاسی منتہا کے مطابق ہندوستان کو خود اختیاری حکومت کی شاہ راہ پر لگا کر چند برس میں اندرونی معاملات میں اسے قطعی آزاد کر دے۔ اور خارجی تعلقات میں دنیا کی مجلس میں اسکا رہبر بنے۔ انگلستان نے جس طرح اور جن جن صعوبتوں سے اپنے بادشاہوں سے آزادی حاصل کی۔ اسی طرح اسے اب اپنے محکوم علاقوں کو خود مختاری کی الف بے سکھانی چاہیئے۔ وہ بعض سیاسیوں کا مداح تھا۔ کیوں کہ انہوں نے ملک کی راہ میں اپنی جان و مال تک کو قربان کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اور بعض نے عملی طور پر اپنی زندگی کو اپنے کھدر کے لباس کا ہمشکل و ہم نوا بنا لیا تھا۔ گاندھی کی قوت اخلاق اور ایثار نفس کا وہ قائل تھا۔ لیکن انہیں "سیاسی سنیاسی" پکارا کرتا تھا۔ اور کہتا تھا بہتر ہوتا اگر وہ ہندوستان کے لئے ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالتے۔ اور بدھ یا نانک کے قدم بقدم چل کر ایک اخلاقی انقلاب پیدا کر دیتے۔ خورشید کو سیاسی زندگی سے ایک خاص انس ہو گیا۔ وہ اسمبلی کے کام کے دنوں میں خوش نظر آتا تھا۔ پٹیل کی آزاد داڑھی۔ رنگا چاریہ کا ٹیکہ۔ رنگا آئر کے کھلے بال۔ جناح کا مسخنی چہرہ۔ گویا اس کے مرقع دل کی تصویریں تھیں۔ جہاں مسلمانوں کے خاص حقوق کا معاملہ درپیش ہوتا تھا۔ وہاں وہ جناح کا پیرو تھا۔ غرض خورشید ہندی سیاست میں ایک قوم پرست تھا۔ لیکن معاشرت کی طرح سیاست میں بھی اسکا طریق عمل مغربی وضع کی تقلید تھی۔ وہ سمجھتا تھا۔ کہ ہندوستانیوں کی جملہ کمزوریوں کا مجرب نسخہ مغرب والوں کی قوت و نظام کا ہندوستان میں رائج کرنا ہے۔ وہ کہتا تھا۔ مغرب کے علم و فن

سیکھو۔ مغرب کی تعلیم، مغرب کی معاشرت اختیار کرو۔ تو تم مغرب کے مقابلے میں کھڑے ہو سکو گے۔ چند اراکین اسمبلی سے اس نے خاص تعلقات پیدا کئے۔ ان میں علاوہ آزاد خیالوں کے ایک پارسی سوراجی بھی تھا۔ جس کا نام فیروز شاہ تھا فیروز شاہ دراصل ایک آزاد خیال آدمی تھا۔ لیکن پنڈت موتی لال کے اثر سے سوراجیوں میں شمار ہوتا تھا۔ اور خورشید اُسے ہمیشہ آزاد سوراجی کہا کرتا تھا۔ کہ فیروز بمبئی کا ایک پارسی لکھ پتی تاجر تھا۔ اور شوقینی و وضعداری میں کسی طرح ہمارے دوست سے کم نہ تھا۔ لہٰذا دونوں میں ہم خیالی کی بنا پر دوستی پیدا ہو گئی۔ جب کبھی فیروز دہلی آیا کرتا تھا۔ تو اکثر دو چار روز خورشید کے پاس قیام کیا کرتا تھا۔

(۵)

دو برس یونہی گذر گئے۔ سیاسی ترقی کے ساتھ ساتھ خورشید نے معاشرتی میدان میں بھی اپنے خیال کے مطابق قدم بڑھایا۔ دہلی میں قیام کے پہلے ہی چند ماہ میں خورشید و قمر کو ایک دوسرے کے خیالات میل جول کے متعلق معلوم ہو گئے تھے۔ ایک حد تک بیوی شوہر پر ایک دوسرے کا جداگانہ طرزِ عمل ظاہر ہو گیا تھا۔ یہ تفاوت بتدریج بڑھتا گیا۔ قمر نے کچھ اتنا پیچھے کو قدم نہ ہٹایا۔ لیکن خورشید کا قدم روز بروز آگے کو بڑھتا گیا۔ پہلے چھ ماہ میں ان کی چند گفتگوئیں بلکہ کہنا چاہیے۔ کہ بحثیں ہوئیں۔ لیکن ایک دوسرے سے اختلاف بڑھتا ہی گیا۔ بعض دفعہ وہ الگ الگ سوچتے تھے۔ کہ آخر ہمارا نقطۂ نگاہ ایک دوسرے سے کچھ اتنا مختلف نہیں کبھی کبھی قمر نے یہ بھی خیال کیا۔ کہ شوہر کی خوشنودی کے لئے اسے شوہر کی کوئی نہ کوئی بات مان لینی چاہیے۔ لیکن اسکا دل ایسی بات کرتے کرتے یوں جھجک جاتا گویا آگے کوئی کنواں ہے۔ اس نے یہ ضرور کیا کہ اور باتوں میں خورشید کی خاطر مدارات میں پہلے زیادہ کوشش اور پہلے سے زیادہ انہماک دکھایا۔ اور اشاروں

میں ظاہر کیا۔ کہ خورشید کی مغربی پسند میں کچھ تو کمی ہو۔ مگر ایسا نہ ہونا تھا نہ ہُوا مغائرت دونوں کے درمیان بڑھتی گئی۔ خورشید سمجھا کہ قمر کے جی میں حسد کا اثر ہے۔ قمر کو شک گذرا کہ خورشید کے دِل میں وہ محبّت نہیں رہی۔ آہستہ آہستہ باہر کے میل جول میں ایسا ہونے لگا۔ کہ خورشید بعض دفعہ قمر کے ساتھ بعض دفعہ الگ اکیلا ہی شریک ہوتا۔ آئے دن کے بلاوے قمر کو ذرا تنگ کرتے۔ یا کہیں مرد کے ساتھ بازو در بازو چل کر کھانے کے کمرے میں جانا ہوتا تو قمر کوئی بہانا بنا لیتی یا خورشید سے اجازت لے لیتی۔ کہ مجھے معاف کیجئے۔ خورشید تیز مزاج نہ تھا لیکن شوقین تھا۔ اور اپنی دھن کا پکا۔ روز بروز انگریزیت کا دلدادہ ہوتا گیا بندشوں کا موقوف کرنا آزادیوں سے لطف اُٹھانا آسان ہے۔ کہیں ذرا سی پی لی۔ جی سے کہا کہ میں شرابی تو ہونے لگا نہیں۔ کبھی کبھی برج بھی کھیل لیا۔ یہ سمجھ کر کہ اسے عقل کے بچّے ہی جُوا کہیں گے۔ بازو در بازو بھی چلے گئے۔ کہ سب ایسا کرنے والے دل لگی کے ارادے سے یہ رسم تھوڑا ہی ادا کرتے ہیں سب سے زیادہ اثر اس پر اس بات کا ہُوا کہ بیسیوں انگریز جو عادتاً مدتوں سے یہ سب کچھ کرتے آئے ہیں۔ نہایت مستقل مزاج نیک طینت اور شریف طبع ہیں۔ اور ان میں سے بعضوں کی سیرت اس قدر زبردست اور متانت پسند ہوتی ہے کہ انہیں عیش وعشرت کا تنکا سمجھ لینا محض اپنی نادانی اور کوتاہ نظری کا ثبوت دینا ہے۔ تو ہندوستانیوں میں جو شخص یہ باتیں کرے۔ ضرور نہیں۔ کہ وہ نیک چلن نہ ہو۔ ضرور نہیں کہ اسکے دِل میں برائی ہی ہو۔ ضرور نہیں کہ وہ بدمست یا زن پرست ہی ہو۔ اور اس کی زندگی خراب وخستہ حال ہی ہو جائے۔ غرض تھوڑے عرصے کے بعد خورشید پکا مغربی بنتا گیا۔ اور قمر کی مخالفت۔ یا بے اعتنائی کو محض لاعلمی اور بعض وقت معصوم کم فہمی پر محمول کیا۔

ایک مرتبہ اسے لنچ پر مدعو کیا گیا۔ تو وہاں اسی شیریں جمشید جی سے ملاقات ہوئی۔ جس کے تمدن یافتہ حسن نے دو برس ہوئے۔ خورشید پر عارضی قابو پایا تھا وہ دن گذر گئے۔ اس کے بعد سینکڑوں خاتونوں سے ملنا ہوا۔ کبھی قمر کی مصاحبت میں کبھی الگ۔ اسکی زندگی بڑی حد تک جدید زندگی بن گئی تھی۔ لیکن ابھی رقص کی نوبت نہ آئی تھی۔ کہ شیریں سے دوبارہ ملنا ہوا۔ ہم نہ مانیں گے۔ کہ خورشید سے بلند حوصلہ۔ مضبوط دل مرد کی نیت میں کسی قسم کا فرق آیا۔ لیکن یہ اس کو کیا کریں۔ کہ بہت سے متمدن مرد بعض مہذب عورتوں کی صحبت میں رہ کر بعض باتیں کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ جو اگرچہ تردامنی پر مبنی نہیں ہوتیں لیکن جن کا نہ ہونا ہونے سے بہتر ہے۔ شیریں سے متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک موقع پر اس نے خورشید کو ہنسی ہنسی میں سہی۔ لیکن رقصانہ حرکتیں سیکھنے کی ترغیب دی اور فن کے لحاظ سے ان پر توجہ کرنے پر بھی مجبور کر دیا۔ سنا ہے کہ آج کل کی شائستگی میں لبسا اوقات بعض ایسی باتوں پر جو مشرقی قدامت کے نقطۂ نظر سے نہایت مخرب اخلاق ہیں۔ مغربی فن پرست بلحاظ فن نہایت سرد مزاجی اور نیک نیتی سے نظر دوڑاتا ہے۔ اور کسی کے چیں بہ جبیں ہونے پر اسکے ہنر شناس کہہ اٹھتے ہیں کہ نکتہ چین کے دماغ میں کیڑے پڑ گئے ہیں۔ اور وہ حقیقت پر نظر نہیں رکھتا۔ اس پر طرہ یہ کہ صحبت اور ابنوہ کا طرز عمل بلا کا اثر رکھتا ہے۔ پتھر کی چٹانیں جن پر سمندر کی لہریں صدیوں ٹکراتی رہیں۔ گھل گھل کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہیں۔ کہاں انسان ضعیف دل اسکے لئے چند برس کی اچھی بری صحبت کافی ہے۔ کہ اسے قطعی طور پر اور کا اور بنا دے۔

خورشید و شیریں کی فن پرستیاں مستقبل میں کیا رنگ لائیں گی؟ کون کہہ سکتا تھا۔ کہ اس سے خورشید و قمر کے تعلقات اور محبت پر کیا اثر پڑیگا۔ کم از کم بچاری

قمر کے لیے کیا قیامت برپا ہوگی؟

ایک روز اسکے سیاسی دوست فیروز شاہ نے اُسے کہا آؤ بھئی آئندہ اتوار کا دن ہمارے ساتھ باہر گذارو۔ لیکن خورشید نے جواب دیا۔ اس روز مجھے ایک قدیمی دوست نے چائے پر بلایا ہے۔ وہاں انکار کرنا محال ہے۔ کیا کروں؟ بات یہ تھی کہ شیریں جمشید جی نے خورشید کو قطب مینار کے قہوہ خانے میں چائے پر مدعو کیا تھا۔ وہ نہ چاہتا تھا۔ کہ اس کا کسی کو پتہ چل جائے۔ وہ سمجھتا تھا کہ شاید مجھے اکیلا ہی بلایا ہو۔ اس لئے پہلے تو گریز کرنا چاہتا تھا لیکن جب شیریں نے شکایت کی۔ اور اصرار کیا کہ آپ مجھ سے اتنا ہی ڈرتے ہیں۔ تو قمر کو اپنے ہمراہ لے آئیے تو بچارا خاموش ہوگیا۔ یہ پہلی بار تھی۔ کہ خورشید کو کسی خاتون سے تنہا ملنے کا سوال درپیش ہوا ہو۔ ایک طرف ابھی یہ خیال دل میں موجود تھا۔ کہ یہ ایک نامناسب بات ہے۔ دوسری طرف معاشرتی زندگی کی اُلجھن تھی۔ اور معلوم نہ ہوتا تھا۔ اس کو کس طرح سلجھایا جائے۔ کہ آداب مجلس میں بھی فرق نہ آنے پائے۔

خورشید اتوار کو موعودہ وقت سے دو گھنٹے پہلے اپنے گھر سے چلا۔ بیوی سے کہا ایک دوست سے ملاقات کا وعدہ ہے چائے وہیں پیوں گا۔ اس دوست کی حقیقت نہ اس کے رفیق سیاسی کو معلوم تھی۔ نہ اسکے رفیق زندگی کو۔ اس قسم کے معاشرتی جھوٹ ہماری متمدن مشرقی و مغربی زندگی میں اکثر بولے جاتے ہیں۔ یہ کچھ بچارے خورشید ہی پر منحصر نہیں۔ البتہ بدقسمتی سے بعض جھوٹ اپنے بولنے والوں پر زحمت بن کر برستے ہیں۔ جب کہ اور جھوٹ بولنے والے اکثر اپنے سفید جھوٹ سے بھی سرخ رُو ہو جاتے ہیں۔

خورشید کو گھر سے نکلے دس ہی منٹ ہوئے ہوں گے کہ مسٹر اور مسز داس

اس کے گھر پہنچے یہ معلوم کر کے کہ صرف قمر وہاں موجود ہے۔ مسز داس اُتریں اور خورشید سے کہا کہ آج قطب مینار کے قہوہ خانے میں شیریں جمشید جی نے تم دونوں کو چائے پر بُلایا تھا۔ مسٹر خورشید کہاں ہیں۔ اور تم کیوں وہاں نہیں گئیں؟

یہ پہلا موقع تھا کہ خورشید قمر کو چھوڑ کر اس طرح ایک "مہم دوست" کی دعوت میں شریک ہونے کو گیا ہو۔ قمر سے یہ تو نہ مانا جاتا تھا کہ خورشید ایک خاتون کی دعوت میں بغیر اسکے شریک ہونا پسند کرے لیکن مدت سے متمدن فن پرستی اور مہذب تفریحات کی یورش سے اس کے نازک دِل پر مایوسی کی گھٹائیں چھا رہی تھیں۔ وہ فراخدل تھی لیکن خودداری و محبت اسے بے بس کئے دیتی تھیں۔ اور اس بھول بھلیاں سے نکل سکنے کی اسے کوئی راہ نہ سوجھتی تھی۔ خورشید ہمیشہ اُسے جدید زندگی کی تمام فروعات میں شرکت کی دعوت دیتا تھا۔ تو قمر کا شریک نہ ہونا اسی کا قصور تھا۔ وہ بھی جدید تفریحات کا مشتاق ضرور تھا۔ لیکن قمر کو ہمیشہ یقین دلاتا تھا۔ کہ اسے ان میں کوئی اخلاقی سقم نظر نہیں آیا۔ وہ کبھی کبھی سوچتی تھی کہ اس سے زیادہ خوش نصیب وہی چار دیواری کی عورتیں ہیں۔ جنہیں وہ قیدی سمجھا کی ہے پھر کہتی نہیں! اعتدال بہترین طریقہ ہے۔ کبھی یہ بھی کہہ اُٹھتی میں نہ ادھر کی رہی نہ ادھر کی۔ پرانے لوگ مجھ پر آوازے کستے ہیں۔ نئے لوگ میری پھبتی اُڑاتے ہیں۔ پھر خاموش ہو رہتی۔ کہ خدایا مجھے اس کشمکش سے رہائی دلا۔ تو ہی کوئی راہ نکال تو ہی کوئی سبیل بتا۔ جس سے یا خورشید راہ پر آجائے یا میں گمراہ ہو جاؤں۔

خورشید قطب پہنچا تو دور ہی سے دیکھا۔ کہ بجائے اکیلی شیریں کے وہاں اور بھی چند اشخاص جمع ہیں۔ اس سے اُسے گونہ اطمینان ہُوا۔ لیکن اس کے تشویش و تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب اس نے مجمع میں مسٹر اور مسز داس

کو دیکھا۔ اور مسٹر داس نے باآوازِ بلند کہا۔ آیئے ہم آپ کے ہاں گئے۔ تو دیکھا کہ مسز خورشید نے آپ کی غیر حاضری نوٹ کر رکھی ہے اور وہ عرقِ شرم میں غرق ہو گیا۔ جب اس نے فیروز شاہ کو شیریں کے پاس بیٹھا دیکھا اور شیریں نے بڑھ کر کہا۔ آیئے مسٹر خورشید کیا آپ میرے منگیتر مسٹر فیروز شاہ کو جانتے ہیں؟

وہ ایک روشن سہ پہر تھی۔ لیکن خورشید پر کیسی گذری اس کا بیان سخت مشکل ہے!

سب نے مل کر چائے پی ——— خورشید پاگل سا ہو گیا تھا ——— آدھ گھنٹہ ادھر اُدھر کی باتیں ہوا کیں ——— ایک ایک لمحہ اسے قیامت کی گھڑی معلوم ہوتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح زمین زلزلے سے پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔ اس کی تمنا تھی کہ پَر ہوں تو وہ اُڑ کر اس معاشرتی دنیا سے دُور کسی تنہا بیابان میں جا بسیرا کرے۔

ایک رسمی سی چاء پی کر ایک لغو سا بہانہ بنا کر وہ وہاں سے رفو چکر ہوا اور شام تک باقی چار گھنٹے اپنی موٹر میں اِدھر اُدھر کبھی تغلق آباد کبھی صفدر جنگ کبھی ہمایوں کے مقبرے کے آس پاس گھومتا رہا۔ اِدھر موٹر کا انجن چھک چھک چل رہا تھا۔ اُدھر اسکے دماغ میں پریشانیوں نے ایک طوفانِ بے تمیزی بپا کر رکھا تھا۔ ہزاروں خیال دل میں آتے جاتے تھے۔ کیا یہی ہے شائستہ زندگی؟ کیا اسی اُدھیڑ بن۔ کیا اسی گورکھ دھندے کا نام معاشرتِ حاضرہ ہے؟ میں نے کوئی بُرائی نہیں کی۔ میں نے ہزاروں خوشیوں کا تعاقب کیا۔ نفرتوں سے اپنے دل و دماغ کو بھر لیا۔ لیکن خدا گواہ ہے مجھے اطمینان نہیں ملا۔ سکون حاصل نہیں ہوا۔ زندگی سے اتنی تسلّی بھی نہیں ہوئی۔ جتنی ایک ہلکی پھلکی چڑیا کو اپنے گھونسلے میں۔

شام کو گھر پہنچا۔ تو باہر باغیچے میں اندر گول کمرے میں بہتیرا ڈھونڈا لیکن قمر کو نہ پایا۔ بے اختیار اپنے کمرے میں بستر پر اوندھے مُنہ لیٹ گیا۔ اور دھاڑیں مار مار کر رونے اور چلانے لگا۔ "قمر میری قمر" کمرے میں اندھیرا تھا۔ در و دیوار سے اُداسی برس رہی تھی۔ خاموشی نے ایک قیامت بپا کر رکھی تھی۔ خورشید اس دن کے بعد جب وہ انگلستان جاتے وقت اپنی علیل والدہ سے رخصت ہُوا۔ آج تک کبھی اتنا ملول بھی نہ ہُوا تھا۔ کہ اس کی آنکھ میں خفیف سی نمی آئی ہو۔ اس کی زندگی خوشی کے لئے وقف تھی۔ اس نے زندگی کا نام ہی خوشی رکھا تھا۔ لیکن آج اُسے زندگی غم کی تصویر معلوم ہوتی تھی۔ رنج و محن کا ایک بُت نظر آتی تھی۔ اسکا جی چاہتا تھا کہ روئے جائے اور اِن تمام خوشیوں کو جو اُسے گذشتہ چھ برس کی نشاط انگیز زندگی میں حاصل ہوئی تھیں۔ اشکوں کے دریائے بیکنار میں ڈبوئے جائے۔

یک لخت کمرے میں برقی روشنی ہوئی۔ اور کسی نے اس کے کانپتے ہوئے ہاتھوں کو تھام کر کہا :۔

"خورشید! میرے بیکار دِن تیری ہی کرنوں سے روشن ہیں"۔

خورشید نے اپنی باہیں قمر کے گلے میں ڈال دیں اور اس کی ہچکی بندھ گئی۔ جس کے معنی تھے :۔

"قمر! میری تاریک راتیں تیری ہی چاندنی سے پُر نور رہینگی"۔

"باغبان"

زکریا کی عروسی

(از میر افضل علی صاحب ایم۔اے کلکٹر ایبٹ آباد)

زکریا اپنے تئیں قبیلہ قریش سے بتایا کرتا تھا اور اپنے عربی النسل ہونے پر اُسے ایسا ہی فخر تھا۔ جیسے آریہ ورت کے برہمنوں یا بخارا کے سیّدوں کو اپنی نجابت پر۔ لیکن اِس قبیلے کی چند پشتیں اسلام آباد میں گذری تھیں اور کشمیر کے اصلی باشندوں میں کھَبیل کی وجہ سے اس کا رنگ و روغن چشم و بینی اور سُنہری بال اطالوی لوگوں کی مانند تھے۔ شاید اسی نسبت سے وہ یورپین سوسائٹی اور ادبی دنیا میں زکریا کے نام سے مشہور تھا۔ ورنہ اسکے تمام رشتہ داروں نے جن سے ملنے کا اتفاق ہُوا۔ بنی ہاشم کے نام آپس میں بانٹ رکھے تھے۔ زکریا کی شکل و شباہت۔ لب و لہجہ اور روانئ زبان سے ظاہر بین لوگوں کو اس کے انگریز ہونے کا شبہ ہوتا تھا۔ اُسے اپنی زباندانی کے ناز کے ساتھ عالم فریبی میں مزا ملتا تھا۔ چنانچہ کالج میں داخل ہوتے ہی اس نے مکمل انگریزی لباس اختیار کر لیا اور پابندی اوقات کے ساتھ دن میں دو بار موچھوں کو صاف کرنے کی اس نے قسم کھا لی تھی۔ انگریزی میں تو وہ اہل زبان کی طرح مضامین لکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ لیکن اردو میں بھی دو چار ایڈیٹروں کو اپنے پیچھے لگائے رکھتا تھا۔

زکریا کے دوست تقریباً سب کے سب یکساں۔ سکون سے بیزار ہنگامہ خیز زندگی کے دلدادہ تھے۔ شعیب گرمی کی تعطیلیں شملہ کی پہاڑیوں میں گذارنا اتنا تھا۔ جہاں سے اُسے شہباز اور حمید الدین متواتر شکار اور سیاحت کی

تحریص دلا کر اپنے پاس بلانا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس چاریاری میں کوہ پیمائی کے ارادے سے پروگرام مرتب ہو رہا تھا۔ کہ زکریا نے شرکت سے انکار کر دیا اور کہا کہ اگر مدعا ہنگامہ خیزی ہی ہے۔ تو میرے لئے پشاور کی زندگی میں کافی مواد دلچسپی کا مل جاتا ہے۔ میں اپنی مصروفیتوں کو آوارہ گردی پر قربان نہیں کر سکتا۔

چنانچہ زکریا کی پشاوری مصروفیتوں کا جو علم ہمیں فسانہ باف راویوں کی زبانی ہوتا رہا ہے۔ اس میں سے فقط ایک شب کی سرگذشت نمونہ کے طور پر قلمبند کیجاتی ہے۔

ایک روز زکریا ٹہلتا ہوا پرانی چھاؤنی کے صدر بازار تک پہنچ گیا۔ واپسی پر چونکہ تاریکی پھیلتی جاتی تھی۔ اس لئے وہ تیز رفتاری کی حالت میں دھیمی سروں میں اپنی تازہ فارسی غزل گا رہا تھا۔ لب سڑک ایک مکان سے تیز روشنی سڑک پر پڑ رہی تھی۔ اور باہر برآمدے میں ایک روسی عورت استرخانی ٹوپی سر پر رکھے اور اودے رنگ کا ریشمی کوٹ پہنے ٹہل رہی تھی۔ جونہی زکریا نیچے سڑک پر سے گذرا۔ وہ عورت بے تابانہ برآمدے میں نکل کر زکریا کے استقبال کو بڑھی۔ اور اشتیاق اور گھبراہٹ کی حالت میں اس نے زکریا کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔ "آخر تم پہنچ گئے"..... "اوہ معاف کرنا مجھے غلطی ہوئی۔ میں آپ کو پہچان نہیں سکی"۔ زکریا نے ٹوپی اتار کر گردن کے اشارے سے سلام کیا۔ اور آگے چلدیا لیکن پھر اُسے خیال آیا۔ کہ شاید یہیں اسے کوئی ایسا واقعہ پیش آئے۔ جو اسکی یکساں زندگی میں دلچسپی کا باعث ہو۔ عورت حسین بھی تھی۔ اور پریشانی اس پر مستزاد تھی۔ جس سے اس کی شربتی آنکھوں میں آتشین چمک پیدا ہو گئی تھی۔ زکریا نے دو قدم پیچھے مڑ کر کہا۔ "میڈم۔ کیا مجھے آپ کی خدمت کا شرف حاصل ہو سکتا ہے"؟

اس کی تیز آنکھوں سے امید کا ایک شرارہ نکلتا ہوا معلوم ہوا۔ جو زکریا کو

مستعد کرنے کے لئے کافی تھا۔ "اگر آپ گوارا کریں"۔

"مجھ پر آپ کلی اعتماد رکھیں"۔

"کمرے میں تشریف لے چلیں تو بتاؤں"۔

چبوترے پر چڑھ کر برآمدے کے دائیں ہاتھ کو بسے ہوئے کمرے میں داخل ہوتے ہی زکریا کو معلوم ہوا کہ تھوڑی دیر میں اس کمرے میں کئی آدمی اس نو وارد روسی خاتون کی میزبانی کا فخر حاصل کریں گے۔ کیا مجھے بھی انہیں میں ایک ناخواندہ مہمان کی حیثیت میں رہنا ہوگا؟

"ایک لحظہ آپ توقف کریں تو میں دیکھ لوں۔ کہ کوئی اجنبی ہماری باتیں نہ سُن سکے"۔

اب زکریا کے دل میں پہلی دفعہ ہراس طاری ہوا کہ کہیں مجھے جال میں پھنسا کر تو یہاں نہیں لایا گیا۔ کیونکہ سرحدی اضلاع میں روزمرہ کے حادثات میں چلتے پھرتے آدمی کا ہمیشہ کے لئے سوسائٹی سے غائب ہو جانا کوئی عجیب بات نہ تھی۔ لیکن پھر اسے خیال آیا کہ میرے پاس سوائے سگریٹ کیس پائپ۔ اور وزیٹنگ کارڈ کے اور کیا ہے جس کے لئے مجھے کوئی آزار پہنچائے۔ میری جان ایسی نادر نہیں۔ کہ اس کے بدلے کسی کو کچھ تاوان ملنے کی بھی امید ہو۔ اور پھر میں تو خود تلاش ہنگامہ میں یہاں آیا ہوں۔ اس سے بڑھ کر اور عجیب موقعہ انسانیت کے مطالعہ کا کیا مل سکتا ہے۔

"آپ اگر میرے ساتھ اوپر تشریف لے چلیں۔ تو میں زیادہ اچھی طرح اپنی حالت بیان کر سکوں گی۔ لیکن آہستہ قدم آیئے تاکہ میرے ملازمین کو پتہ نہ لگے۔ کہ آپ میرے ہمراہ ہیں"۔

زکریا چلنے کو ساتھ ہو لیا۔ لیکن اب اس کا دل ایسی تیزی سے دھڑکنے

لگا۔ کہ اُسے شُبہ سا ہُوا کہ کہیں میری قلبی حرکت چہرے سے تو ظاہر نہیں ہوتی بہرحال وہ دبے پاؤں چٹائی دار سیڑھیوں سے گذر کر ایک بڑے ملاقی کمرے میں داخل ہُوا۔ کمرہ ایسی خوش سلیقگی سے آراستہ کیا گیا تھا کہ زکریا کو شُبہ نہیں ہوسکتا تھا۔ کہ اِس عشرت کدے میں کوئی خلاف معمول حادثہ واقع ہوسکتا ہے۔ اچانک اسکی نگاہ ایک مخملی سوفے پر پڑی جس پر ایک آدمی بے تحاشا لیٹا ہُوا خراٹے لے رہا تھا۔

عورت نے ناٹک کے انداز میں ہاتھ پھیلا کر اور رونی صورت بنا کر کہا۔ "دیکھئے یہ آپ کے سامنے میرا خاوند پڑا ہے۔ اسکی بدمستی نے آبرو خاک میں ملادی ہے۔ زکریا نے تعجّب سے دیکھ کر اپنے دل میں کہا۔" تو کیا مجھے اپنے شرابی خاوند کی ملاقات کے لئے یہاں بلایا گیا ہے؟"

اس نے سرد مہری اور متانت سے جواب دیا۔ "معلوم ہوتا ہے۔ آپ کا خاوند بہت بے اعتدال ہے۔ مجھے بتائیں میں آپ کی کیا مدد کرسکتا ہوں؟"

عورت نے ملتجی نگاہوں سے اپنے دونوں ہاتھ زکریا کے شانوں پر رکھ کر بصد الحاح کہا۔ "کیا آپ کو خیال ہے۔ کہ مَیں نے آپ کو بے سود زحمت دی ہے۔ آپ پہلے میری دُکھ بھری کہانی تو سُن لیں۔ تین سال ہوئے میں نے ہارڈنگ کے ساتھ طہران میں اپنے خاندان کی خلاف مرضی شادی کی تھی۔ میرے چچا نے جو روس کی تباہی کے بعد پشاور میں چلے آئے تھے۔ مجھے ایران سے اپنے پاس بلالیا۔ اِن کا ارادہ تھا۔ کہ میرے والدین اور تمام رشتہ داروں کو جو آج کل یہاں ہیں۔ کہہ سن کر میرا قصور معاف کرادیں۔ چنانچہ آج شام انہوں نے سب کو دعوت پر میرے خاوند سے ملانے کے لئے بلایا ہے۔ آج تیسرے پہر تک میرا پیارا ہارڈنگ انسان تھا۔ مگر اس وقت اِس پر

وحشت طاری ہے کیا میں ایسے وحشی کو اپنے عزیزوں کے سامنے پیش کرونگی۔"

"میں انہیں تو در کنار اپنے ملازموں کو بھی اس ذلیل حالت سے آگاہ نہیں کر سکتی۔ وہ ضرور کہیں گے کہ مجھے شرم سے ڈوب مرنا چاہیئے۔ اور میرے عزیزوں کے چہروں پر انتقامی تبسم ہو گا۔ وہ سب کہینگے۔ ہم نہ کہتے تھے! میں اپنی شرمناک حالت کو ان کی نگاہ سے چھپانا چاہتی ہوں۔ بتایئے میں کیا کروں؟

زکریا کو مشکل پڑنے پر جھوٹ بنانے اور حکایت سازی میں کبھی دریغ نہیں ہوا۔ اس نے کہا "ہارڈنگ کو بستر میں سلا دو۔ وہ بالکل بے ہوش ہو گا۔ کہنا اچانک بیمار ہو گیا۔ اِس طرح وقت گذر جائیگا۔"

کیا وہ اوپر آ کر بیمار پرسی نہ کریں گے۔ اگر میں کہوں کہ ڈاکٹر نے ملنے سے منع کیا ہے۔ تو کہیں گے ایسی بیماری کی حالت میں اگلے جمعہ کو وہ کراچی کا سفر کیسے کریگا۔ کیونکہ میں نے اِس قضیہ کو مٹنے کے واسطے ارادہ کیا ہے۔ کہ چار روز بعد اپنے رشتہ داروں سے ہمیشہ کے لیئے رخصت ہو جاؤں۔ اور اپنی شرم کو اپنے ساتھ لیئے پھروں۔ میں نے ایک لڑکا ڈاکٹر کی طرف دوڑایا تھا کہ وہ آ کر انہیں ہوش میں لائے۔ لیکن وہ ابھی تک نہیں لوٹا اور وقت بہت کم باقی ہے۔ میں اِسی کے انتظار میں تھی کہ آپ آ گئے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میں اس معاملے میں ملازموں سے اخفا کیوں کرتی ہوں۔ للہ مجھے بتایئے میں کیا کروں۔ یہ کہہ کر وہ زکریا کے قدموں میں فرش پر بیٹھ گئی اور ایک اندازِ دلربائی کے ساتھ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ لیئے۔ اور لمبے سُنہری بالوں کو پیشانی پر بکھیر دیا۔ زکریا اس تھیٹریکل حرکت کو دیکھ کر کچھ محظوظ ہوا اور کچھ اس کی بدگمانی میں اور اضافہ ہوا۔ کہ کہیں مجھے کسی

جال میں تو نہیں پھنسایا جا رہا۔ زکریا کو معلوم ہو گیا کہ ایسی تیز فہم عورت کے سامنے وہ پہلے ہی اپنی پھیکی سی تدبیر بتا کر شرمندہ ہوا ہے۔ اب مزید کوشش کرنا اپنی بیوقوفی کا اظہار ہے۔ اس لئے اس نے کہا "جیسے کہو میں ہر طرح حاضر ہوں"۔

"آپ انہیں اٹھا کر دوسرے کمرے میں چارپائی پر تو ڈالیں" زکریا نے کہا بہت خوب"۔ اس نے ریشمی رومال اپنے کف سے نکال کر اپنے لبوں پر پھیرا۔ اور جیب میں رکھ لیا۔ اور پائپ کی راکھ جھاڑ کر میز پر رکھ دی اور آستین چڑھا کر لاش کو سیدھا کیا۔ ہارڈنگ کی چھوٹی سُرخ رنگ کی ڈاڑھی اور لمبی مونچھیں خاک سے اٹی ہوئی تھیں۔ اسکا رنگ سُرخ اور سر کے گھونگریالے بال اُلجھے ہوئے تھے۔ کالر میں شکن پڑے تھے۔ اور نکٹائی کالر سے اُتر کر گلے میں پھانسی کے پھندے کی طرح اُلجھی ہوئی تھی۔ واسکٹ اور قمیص کے بٹن کھُلے تھے۔ اس ہیئت کذائی میں بھی وہ خوبصورت آدمی معلوم ہوتا تھا بڑی مشکل سے زکریا نے ہارڈنگ کو کھڑا کیا اور وہ دیوانوں کی طرح اپنے گرد و پیش دیکھنے لگا۔ اور پھر زور سے کھنکار کر فرش پر اوندھے منہ گر پڑا۔ زکریا نے اُسے اپنے شانوں پر اُٹھا کر دوسرے کمرے میں چارپائی پر ڈالا۔ اور دروازہ بند کر کے نکل آیا۔

"کمرے کو مقفّل کر دینا چاہیئے۔ کہیں وہ پھر باہر نہ نکل آئیں"۔

زکریا حیرت زدہ عورت کے پیچھے پیچھے نیچے کمرے میں چلا گیا۔ وہ دِل میں سوچ رہا تھا۔ کہ یا اللہ اب میری معلمہ مجھے کیا کہتی ہے" شاید آپ خیال کریں۔ کہ میں آپ کو ضرورت سے زیادہ زحمت دے رہی ہوں۔ لیکن میں بالکل حواس باختہ ہوں"۔

زکریا تسلیم کے انداز میں جھکا اور کرسی عورت کے سامنے رکھ کر سر و قد

کھڑا رہا۔ دو منٹ سکوت کے بعد عورت بولی "کیا آپ آج دعوت کی تقریب پر میرے خاوند کی حیثیت میں شامل ہو سکتے ہیں؟"

زکریا اپنی زندگی میں کسی بات پر اچنبا ظاہر کرنا انسانی کمزوری کی دلیل سمجھا کرتا ہے۔ مگر یہ تجویز سُن کر اُچھل پڑا۔ پھر سنبھل کر بولا "لیکن اس پارٹ کو انجام تک نبھانا دشوار ہوگا۔"

"بیفکر رہیں۔ ذرا بھی دقّت نہیں ہوگی۔ اِن میں سے کسی نے بھی میرے خاوند کو نہیں دیکھا۔ آپ کا قد میرے خاوند کے قد کے برابر ہے۔ آپ کی آنکھیں ذرا زیادہ شوخ اور ناک قدرے موٹی ہے۔ ڈاڑھی لگا کر آپ بالکل میرے خاوند کے مشابہ ہو جائینگے۔"

"ڈاڑھی!"

"میں اپنی ملازمہ کو ابھی آرم جی ماموں جی کی دُکان پر بھیجتی ہوں۔ وہ خضخضی ڈاڑھی لے آئیگی۔ ابھی مہمانوں کے آنے میں آدھ گھنٹہ باقی ہے۔"

زکریا نے دیکھا کہ وہ اسکے جواب کی منتظر کھڑی ہے۔ لیکن اپنی زندگی میں پہلی بار زکریا کی زبان جو قینچی کی طرح چلا کرتی ہے۔ خاموش رہ گئی۔ اس نے سوچا۔ مشکلات کا متلاشی تو میں ہمیشہ رہا ہوں۔ لیکن کہیں یہ مشکل آخری نہ ہو۔ کیا یہ عورت اپنے مہمان بلا کر اُن کی تواضع کے لئے مجھے بے وقوف تو نہیں بنا رہی ہے۔ کیوں کہ اسکا ذرا سا غمزہ مجھے بھری محفل میں بے ڈاڑھی کر سکتا ہے۔ اسوقت میری کیا حالت ہوگی۔

"خدا کے لئے آپ انکار نہ کریں۔ مجھ پر عجب وقت آپڑا ہے۔ آپ فرشتۂ رحمت بن کر آئے ہیں۔ میری دستگیری کریں۔ تو میں ہمیشہ کے لئے شرم کی زندگی سے بچ جاؤں گی۔ یہ مرحلہ طے ہو جائے۔ تو میں ہارڈنگ کو لیکر

بغداد چلی جاؤں گی۔ وہاں جاکر اسے شراب پینے کا موقعہ نہیں ملیگا۔ لیکن للہ اسوقت میرے پیارے خاوند کو بے آبروئی سے بچایئے۔"

"میڈم میں ہر طرح حاضر ہوں۔"

ملازمہ ڈاڑھی لینے گئی۔ زکریا کو ہارڈنگ کا سوٹ پہنا دیا گیا۔ اور روسی عورت نے بڑی محبت کے انداز میں اسے اپنے پاس صوفے پر بٹھا کر اس کے رخساروں پر اپنی انگلیوں سے سرخ روغن ملنا شروع کیا۔ پھر ڈاڑھی اس کے چہرہ پر مڑھ دی گئی۔ زکریا پر جتنے عرصہ تک یہ سحر ہوتا رہا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند رکھیں۔ عورت نے پُر ترنم لہجہ میں اسکا شانہ ہلا کر کہا۔ "ہنری پیارے۔ ہنری باہر مہمان آپکا انتظار کر رہے ہیں۔" اور یہ کہہ کر وہ قہقہہ لگاتی اور اپنی ایڑیوں پر ناچتی ہوئی نیچے اُتر گئی۔

۹ بجے وہ مہمانوں کے کمرے میں داخل ہوا۔ روسی عورت بولی "گھبراؤ نہیں میں نے سب کو کہہ دیا ہے۔ کہ تم شام کو اکثر دیر بعد شہر سے آتے ہو اور میرے سامنے عذر کر دیتے ہو۔ کہ یکہ توت میں مواجبات وصول کرنے گیا تھا۔ یہ ہیں۔ میرے چچا جوزف۔ یہ میری خالہ میریا ہیں۔ یہ میری خالہ زاد ایمیلا کیتھرائن ہیں۔ ابّا نے کہلا بھیجا ہے۔ کہ وہ شاید بہت دیر بعد آئیں۔ اس لئے ان کا انتظار نہ کیا جائے۔ ہنری تم خالہ جان کو راستہ بتاؤ۔ کھانا چُنا گیا ہے۔"

وہ سب دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ ہنری ہارڈنگ نے بھاری بھرکم نئی خالہ میریا سے اپنے تئیں بے تکلف کرنے کی کوشش کی۔ اس نے میز کے گرد نگاہ دوڑا کر اپنے دل میں کہا۔ "اف میری بیوی کے رشتہ دار کیسے بدصورت ہیں۔ شکر ہے میرا ان سے سابقہ ایک ہی رات تک ہے۔"

کھانا بافراط اور کئی قسم کا تھا اور چٹنی مربے کی زیادتی نے کھانے کو لذیذ

بنا دیا تھا۔ زکریا کو تعجب تھا کہ کھانے پر تو میری بیوی نے اس قدر اسراف اور نفاست برتی۔ لیکن ویٹر اس نے ایسے بے تمیز رکھے ہیں۔ جو میری طرف یوں گھور رہے ہیں۔ گویا کھا جائیں گے۔

زکریا نے خالہ میریا سے کہا۔ "یہ آدمی یا تو بالشویک سپاہی ہے یا پولیس میں ہے دیکھو تو میری بیوی کی کرسی کے پیچھے کیسا تنا کھڑا ہے۔ گویا کہ پہرہ پر کھڑا کیا گیا ہے۔"

خالہ میریا یہ بات سنتے ہی اچھل پڑیں اور اس تیزی سے سانس لینے لگی کہ زکریا سمجھا اب انہیں غش آیا چاہتا ہے۔ اس نے کہا "خیر یہ تو مذاق تھا۔ لیکن فوج سے اس قدر سپاہی نکل کر آئے ہیں۔ کہ جہاں دیکھو بہرہ۔ ویٹر۔ چپڑاسی سب کے سب سکدوش شدہ فوجی سپاہی ہی نظر آتے ہیں۔

خالہ میریا نے سنبھل کر کہا۔ "ایسے بھیانک رنگ کے مذاق سننے سے مجھے بہت الجھن پیدا ہوتی ہے۔"

زکریا نے بیوی کی خالہ کا خیال چھوڑ کر مہمانوں کی طرف توجہ کی تو دیکھا۔ کہ سب لوگ بے دلی سے کھانا کھا رہے ہیں اور سب سے زیادہ پرخور اس مجلس میں یا تو زکریا خود تھا یا اس کی نئی بیوی۔ وہ اب اپنے نئے عارضی خسر کے انتظار میں تھا۔ کیونکہ اسکی بیوی نے ایک سے زیادہ دفعہ افسوس ظاہر کیا تھا کہ ابا ابھی تک نہیں پہنچے۔ ابھی آتے ہی ہوں گے۔

زکریا نے سوچا کہ میں تو ایسا خوش نصیب نہیں کہ اس لیڈی کے خاوند بننے کی عزت مجھے دائمی میسر رہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ میری بیوی کے رشتہ داروں نے مجھے پسند نہیں کیا۔ میرے بعد ہارڈنگ کی زندگی اپنی سسرال میں ضرور بڑا مزہ ہوگی۔

آخر خواتین ہاتھ صاف کرکے دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ اور اب کمرہ تھری کیسل سگریٹ کے دھوئیں سے بھر گیا۔ زکریا کو اپنے مہمانوں سے ایسی نفرت تھی کہ اس نے زور زور سے کش لگا کر اپنے چہرے کے سامنے دھوئیں کی ایک دیوار حائل کردی۔

اسے ابھی سگریٹ سے کھیلتے تین منٹ بھی نہیں ہوئے تھے۔ کہ ہوٹل کے ویٹر واپس کمرے میں داخل ہوئے۔ دو تو دروازہ پر ایستادہ ہوگئے۔ اور تیسرے نے زکریا کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا "بحکم بادشاہ سلامت ہنری ہارڈنگ میں تمہیں جعل سازی کے جرم میں گرفتار کرتا ہوں۔" زکریا نے مسکرا کر کہا "شیطان تجھے یہ حوصلہ کس طرح ہوا۔" کیونکہ زکریا اس ڈرامے میں اپنا پارٹ خوش اسلوبی سے کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس نے دیکھا کہ مہمان گھبراہٹ میں کرسیوں پر گرنے لگے اور اسکے ہاتھوں میں زنجیریں ڈالدی گئیں۔

یورپین سارجنٹ نے کہا "ولیمز! میں اور ہیبت کھاں" تو ان کو قابو میں کرلیں گے۔ لیکن بوڑھا کرنل پھر چکمہ دے گیا۔ تم ذرا لیڈی صاحبہ کو حراست میں کرلو۔ ولیمز یہ سن کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ سارجنٹ نے پھر تحکمانہ لہجے میں کہا "ہیبت کھاں ان سب کے پتے لکھ لو۔

"صاحبان! مجھے آپ سے کچھ سروکار نہیں۔ آپ فقط اپنا پتہ دے جائیں تاکہ ممکن ہے۔ آپ کو شہادت کے لئے بلایا جائے۔

زکریا کی سسرال والے جب سب کانپتے ہوئے اپنے پتے لکھا کر رخصت ہوئے۔ تو اس نے کہا "اس ڈرامے کا اب خاتمہ ہونا چاہئے۔ کیا واقعی آپ ہنری ہارڈنگ کو گرفتار کرنے کے لئے آئے ہیں۔"

"ہاں یہ ہے وارنٹ۔ نہ فقط تمہیں بلکہ تمہاری بیوی مسز ہارڈنگ اور

تمہارے ساتھی کریوال کو بھی۔"

"خوب! تو میں آپ کو مطلع کرتا ہوں کہ آپ اپنا وقت ضائع نہ کریں۔ ہنری ہارڈنگ اگر بھاگ نہیں گیا تو بدمست اوپر کی منزل میں اپنے بستر پر بے ہوش پڑا ہوگا۔"

"اوہ اب تم میرے قابو سے نہیں نکل سکتے۔ تم ہی اس گھر کے مالک ہو۔ اور ہنری ہارڈنگ کے نام سے مشہور ہو۔ میرے پاس تمہاری تصویر ہے۔"

"کیا آپ میری داڑھی زیادہ غور سے ملاحظہ کر سکتے ہیں؟"

سارجنٹ نے داڑھی کھینچ لی۔ اور کہا اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تمہاری کیفیت کا آدمی گذشتہ جرائم کی پاداش سے بچنے کے لئے مصنوعی داڑھی لئے پھرے۔ تو کیا عجب ہے۔"

زکریا اپنی بیگناہی پر مطمئن پولیس والوں کی ذہانت پر دل میں مسکرا رہا تھا۔

دوسرا سارجنٹ اتنے میں لیڈی کو گرفتار کر کے لے آیا۔ اور فاتحانہ انداز میں اپنا طپنچہ میز پر رکھ کر خود تن کر کھڑا ہو گیا۔

لیڈی نے قہقہہ لگا کر کہا "واقعی پولیس نے آج تو کمال کر دکھایا۔ اصلی شکار تو مدت ہوئی نکل گیا۔ آپ نے بیگناہ آدمی کو پکڑ رکھا ہے۔ آپ نے اصلی ملزم کی بیوی کو گرفتار کر لیا ہے۔ جسکا آپ کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ جب آپ بطور وسیٹر کے میرے پاس آئے تھے۔ تو آپ کو یقین تھا۔ کہ آپ ہارڈنگ اور کریوال کو نہایت سہولت سے گرفتار کر لیں گے۔ لیکن کریوال آسانی سے آپ کے قابو میں آنے والا نہ تھا۔ وہ آپ کی سازش سے واقف تھا۔ اور اس نے ہمیں بھی مطلع کر دیا تھا

"پھر زکریا کی طرف ملتجی نگاہوں سے مخاطب ہوئی۔"

"میں آپ کی بیش قدر امداد کے لئے ممنون اور فریب سازی کے لئے شرمسار ہوں۔ مگر میں حفظِ جان کے لئے ایسا کرنے پر مجبور تھی۔ آپ کی مہربانی اور خلق سے

میں اس قدر متاثر ہوئی تھی کہ اگر آپ کے بغیر گذارہ چل سکتا۔ تو میں کبھی آپ کو تکلیف نہ دیتی۔ میں اپنے دروازے پر کھڑی اپنے پیغامبر کا بیتابی سے انتظار کر رہی تھی۔ جسے میں نے امداد مہیا کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ کہ اتنے میں آپ نظر پڑے۔ آپ کی شکل میرے خاوند سے اس قدر مشابہ تھی۔ کہ بجلی کی طرح میرے دماغ میں موجودہ تدبیر روشن ہوگئی۔ پھر جو کچھ میں نے آپ سے خاوند کے بارے میں کہا۔ وہ محض سازش تھی میرا خاوند نشہ میں نہ تھا۔ بلکہ جب آپ نے اسے مقفل کر دیا۔ اور آپ اسکی جگہ مہمانوں میں آ گئے۔ تو وہ پولیس کی آنکھوں میں خاک جھونک کر بھاگ گیا۔ جو لوگ یہاں میرے رشتہ دار بن کر آئے تھے۔ ان سے محض ہمارا کاروباری تعلق ہے۔ اور انہیں میں نے بمنت اس ڈرامے کے لئے تیار کیا تھا بعض نے اپنا پارٹ ایسی سنجیدگی سے کیا کہ آپ کے دل میں شاید شبہ پیدا ہوا ہو۔ میرا باپ جو آخری وقت تک نہ پہنچا حقیقت میں میرے خاوند کا دوست کریوال تھا۔ میں اس کے متعلق بے تابی اور انتظار کا اظہار اس لئے بھی کر رہی تھی۔ کہ مہلت پاکر دونوں ملزم پولیس کے چنگل سے نکل جائیں اور دوسرے کریوال کو گرفتار کرنے کی ہوس نے سراغرسان ویٹروں کو بہ تعجیل مجلس درہم برہم کرنے سے باز رکھا۔ اب وہ دونوں پولیس کے ہاتھ سے بالکل محفوظ ہیں۔ آپ مطمئن رہیں۔ آپ کا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔ میرے قصور کو بخشدیں۔"

"میڈم میں آپ کے حیرت انگیز فسانہ باف دماغ اور ایکٹ کرنے کی قابلیت پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔"

اب لیڈی نے اپنی شرمگیں شوخ آنکھیں حجاب سے نیچے جھکالیں۔ اور پولیس سے یوں مخاطب ہوئی۔

"آپ یقین کریں۔ اگر اس وقت آپ کی ناحق زحمت کا کوئی ذمہ دار ہے

تو فقط میں۔ اس خطے میں کا کوئی قصور نہیں۔"

لیکن پولیس زکریا کو بغیر اپنا کامل اطمینان کیے کب چھوڑنے والی تھی۔ بیچاری کو تمام رات اسی مکان میں پولیس کے پہرے میں گذارنی پڑی۔ صبح کو اسکا پتہ لکھ کر اسے رخصت کیا گیا۔ پشاور میں سر کرشن گاہ کی تلاش کا یہ پہلا تجربہ تھا۔

سزائے اعمال

(از جناب سدرشن صاحب جرنلسٹ)

(۱)

رات کے دو بجے سادھو اپنے گرم بستر سے اُٹھا۔ اور ندی کے کنارے جاکر کھڑا ہو گیا چاروں طرف تاریکی تھی۔ آسمان پر تارے ٹمٹما رہے تھے۔ کسی طرف سے کوئی ہلکی سی بھی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ دنیا اور اسکے پر شور ہنگامے اس خاموش تاریکی میں اس طرح غرق ہو چکے تھے جس طرح کوئی کشتی بمعہ اپنے مسافروں کے طوفانی سمندر کی گرجتی ہوئی لہروں میں سما جائے۔ سادھو کے قدموں کی چاپ دور دور تک سنائی دے رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا قدرت کی خاموشی اس سادھو کی بے موقعہ دست اندازی کے خلاف بغاوت کر رہی ہے۔ مگر جس طرح سادھو نے دلکش خوابوں سے بھرے ہوئے گرم بستر اور اسکے پر سکھ آرام و آسائش کا خیال نہ کیا تھا۔ اسی طرح قدرت کی اس سکوت پاش صدائے احتجاج کی پروا نہ کی۔ اور اپنے جھونپڑے سے نکل کر ندی کے کنارے پہنچ گیا۔

پانی سرد تھا۔ جیسے کسی بے پروا ملازم نے اپنے شرابی آقا کے متواتر تقاضوں سے تنگ آکر تھوڑے سے پانی میں زیادہ برف ڈال دیا ہو۔ سادھو نے اسکی طرف دیکھا اور اسکے جسم میں روح کانپ گئی۔ اس نے بیٹھ کر پانی میں ہاتھ ڈالا۔ اور لرز کر پیچھے ہٹا لیا۔ معلوم ہوتا تھا۔ ندی بھی اس مداخلت کو گوارا نہ کرتی تھی۔ اس نے اپنے تمام تر برفانی اثرات کو سادھو کے ہاتھ پر تازیانے کی صورت میں آزمایا۔ اور نتیجہ دیکھنے کے لیئے ٹھہر گئی۔ مگر سادھو پر اس تنبیہہ کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے جلد جلد اپنی سیاہ کملی جسم

سے الگ کی۔ اور آنکھیں بند کر کے پانی میں کود پڑا۔

سادھو پر بیہوشی کی سی حالت طاری ہو گئی۔ اور وہ پانی کی لہروں کے ساتھ ساتھ اِس طرح بہنے لگا۔ جیسے کوئی مجرم سپاہیوں کے حلقہ حراست میں تھانے کو جا رہا ہو یکایک وہ اپنے پاؤں ندی کے پانی سے بھی زیادہ سردیت پر جما کر کھڑا ہو گیا۔ اور اپنے جسم و روح کی انتہائی قوتیں صرف کر کے کنارے پر چڑھا۔ اسوقت اسکے چہرہ پہ مسرت کا رنگ جھلکتا تھا۔ مجرم سپاہیوں کے حلقہ سے باہر نکل آیا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنے جھونپڑے میں واپس آگیا۔ اور اپنے بستر کے قریب کھڑا ہو کر اسکو اس طرح نگاہِ بے بسی سے دیکھنے لگا۔ جیسے کوئی فاقہ کش غریب کسی امیر آدمی کو بہترین کھانے کھاتے دیکھ کر بیتاب ہو جاتا ہے۔ مگر اسکے سوائے اور کچھ نہیں کر سکتا۔ کہ اپنی فاقہ مستی پر قناعت کرے۔ یہاں اس نے اپنی کملی پھر اتار دی۔ اور کونے سے ایک کوڑا اٹھا کر اسے اپنے جسم پر ہاتھوں کی پوری قوت سے مارنے لگا۔

ہوا اسکے پر درد نالوں سے گونج رہی تھی۔ مگر وہ اپنے جسم پر اُسی زور سے کوڑے برسا رہا تھا۔ گویا اسکے ہاتھ اسکے جسم کا حصہ نہ تھے۔ اور وہ کسی آدمی پر نہیں بلکہ بے جان تودے پر اپنی قوت آزمائی کر رہا ہے۔ جب سفیدۂ سحر نمودار ہوا۔ تو لوگوں نے دیکھا کہ سادھو اپنے جھونپڑے کے سرد فرش پر بیہوش پڑا ہے اور اس کے جسم کے کئی حصّوں سے خون جاری ہے۔ انہوں نے آگ جلائی۔ اور اسکے سرد جسم کو کمبل میں لپیٹ کر اسکے قریب رکھ دیا۔ جب دو تین گھنٹے گذر گئے۔ تو اس نے آنکھیں کھولیں اور آہ سرد بھر کر اُٹھ بیٹھا۔

مگر اب اس میں وہ استقلال نہ تھا۔ اُسکی جگہ سسکیوں اور ہچکیوں نے لے لی تھی۔ کچھ دیر کے بعد جب اسکی اشک باری تھمی۔ تو اس نے اپنے ہاتھ

آگ پر گرم کرتے ہوئے کہنا شروع کیا :۔

(۲)

پچاس سال گذرے جب میں نے ایک غریب کی حیثیت سے دنیا کی جد وجہد میں قدم رکھا۔ اُس وقت نہ ضروریاتِ زندگی ایسی وسیع تھیں نہ اشیاءِ حاجت ایسی گراں۔ پچاس ساٹھ روپے کمانے والا آدمی بادشاہ سمجھا جاتا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ایسے آدمیوں کو دیکھا ہے۔ جو پندرہ بیس روپے پیدا کرتے تھے۔ اور دس بارہ آدمیوں کے کنبہ کی پرورش کرتے تھے۔ اور بڑے شاہانہ طریق سے۔ اب یہ واقعات خواب و خیال کی باتیں ہوگئی ہیں۔ لوگ انہیں باور نہیں کرتے۔ روپے کی قیمت چونّی بھی نہیں رہی۔ اس زمانہ میں لوگ غریب نہ ہوں۔ یہ بات غلط ہے۔ میں خود غریب تھا۔ ایسا غریب جسے کئی کئی دن فاقے سے گذر جاتے تھے۔ میں نے کئی جگہ ملازمت کی کوشش کی۔ مگر کہیں کامیابی نہ ہوئی۔ معمولی کام کرنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ دنیا کی شرم پاؤں کی زنجیر بن جاتی تھی۔ لیکن جب کئی مہینے متواتر ناکامیوں میں بسر ہوئے تو شرم جاتی رہی میں نے مٹھائی کا خوانچہ لگانا شروع کر دیا۔ چند ہی دنوں میں حالت تبدیل ہوگئی۔ آرام سے گذر اوقات ہونے لگی۔ یہانتک کہ چند سال کے خاتمہ پر میرے پاس ڈیڑھ سو روپیہ نقد جمع تھا۔

یہ رقم آج کل کے زمانہ میں کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔ مگر اس زمانہ میں لوگ اسے گرانقدر رقم تصوّر کرتے تھے۔ میری خوشی کا ٹھکانا نہ تھا۔ ایسا خوش پھرتا تھا جیسے کسی کو پٹوار مل گئی ہو۔ ہنسنے کی بات نہیں۔ پٹواری کا عہدہ اس زمانہ میں ایسا نظر فریب عہدہ تھا۔ جیسی آج ڈپٹی کمشنری بھی نہیں۔ میری قسمت اوج پر تھی۔ دو اولوالعزم آدمیوں سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کہا۔ کیا مزدوری

کر رہے ہو۔ ہمارے ساتھ مل کر بیوپار شروع کر دو۔ تو چند ہی دنوں میں سونا ہو جاؤ۔

بات معمولی تھی۔ لیکن میرے دل میں شوق پیدا ہو گیا۔ میں نے خوانچہ کا کام چھوڑ دیا۔ اور ان کے ساتھ مل کر بیوپار کرنے لگا۔ ہم ایک جگہ سے سستا مال خریدتے تھے دوسری جگہ مہنگے داموں بیچ دیتے تھے۔ چند ہی ماہ میں روپیہ کنکروں کے مانند آنے لگا۔ معلوم نہیں قسمت کی خوبی تھی یا ہماری عقل کا کرشمہ۔ مٹی کو ہاتھ لگاتے تھے۔ تو وہ بھی سونا ہو جاتی تھی۔ بیوپار میں نفع بھی ہوتا ہے نقصان بھی۔ مگر پرماتما جسے دینے پر آتا ہے۔ اُسے نقصان نہیں ہوتا۔ معلوم ہوتا ہے۔ پرماتما ان دنوں ہم پر دینے پر تلا ہوا تھا۔ ہمیں کسی سودے میں نقصان نہ ہوتا تھا۔ اسی طرح تین سال گذر گئے۔ اسوقت ہمارے پاس کافی رقم تھی۔ ہم نے معمولی سودے کرنا ترک کر دیا اور لکڑی کا کام کرنے لگے۔ اس کام کو آہستہ آہستہ ایسا فروغ حاصل ہوا کہ ہم کو اس پر خود حیرت ہوتی تھی۔ روپیہ پانی کے مانند آنے لگا۔ دس سال کے بعد جب حساب کیا گیا۔ تو ہمارے حساب میں دو لاکھ سے زائد روپیہ جمع تھا۔ اب ہمارے دلوں میں میل آنے لگا۔ جب تک غریب تھے۔ تب تک ایک دوسرے پر اعتماد تھا۔ مگر امیر ہوئے تو وہ اعتماد قائم نہ رہا۔ ایک دوسرے پر شک و شبہ کرنے لگے۔ کبھی کبھی جوش میں بھی آجاتے تھے۔ اس وقت ہم ایک دوسرے کو اس طرح دیکھتے تھے۔ گویا ہم آدمی نہیں بلکہ خونخوار بھیڑیے ہیں۔ دولت نے آنکھوں پر پردے ڈال دیئے تھے۔ ہم میں سے ہر ایک یہی چاہتا تھا کہ دوسرے شریک کا مر جائیں۔ تو ساری دولت اسی کی ہو جائے۔ کچھ دنوں یہ خیالات دبے رہے۔ جیسے راکھ تلے انگارے۔ مگر کب تک؟ آخر کار فیصلہ ہوا کہ شرکت توڑ دی جائے۔ اور سب الگ الگ ہو جائیں۔ آگ کے شعلے راکھ سے باہر نکل آئے +

(۳)

میرے شریک کار لالہ پربھو داس اور لالہ حکمت رائے تھے۔ پربھو داس آدمی سمجھدار تھا۔ مگر بُرا نہ تھا جو کچھ دل میں ہوتا زبان سے کہہ دیتا۔ وہ بات نہ چھپاتا تھا۔ نہ چھپانا چاہتا تھا۔ اسکی یہ خصلت بد (؟) ہمیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ اسکے برخلاف حکمت رائے بیحد چست و چالاک تھا۔ وہ اپنے جذبات کو چہرے پر نہ آنے دیتا تھا۔ دل میں ناراض بھی ہوتا۔ تو ہنس ہنس کر باتیں کرتا۔ جیسے اُسے کوئی ملال ہی نہیں۔ میں اسکی اس خوبی (؟) پر جی جان سے فدا تھا۔ پیتل پر سونے کا دھوکا ہو رہا تھا۔ جب کسی بات پر جھگڑا ہو جاتا۔ تو میں اور حکمت رائے ایک طرف ہوتے پربھو داس دوسری طرف ہم دونوں کے مقابلہ میں اسکی کوئی پیش نہ جاتی تھی۔ جیسے دو خونخوار بھیڑیوں کے سامنے ایک غریب کتا کبھی ٹھہر نہیں سکتا۔

جب الگ الگ ہونے کا فیصلہ ہو گیا۔ تو حکمت رائے میرے پاس آیا۔ اور بولا "تو اب الگ الگ ہونے کی نوبت آگئی"۔

میں نے اُسکے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اور کیا ہو سکتا ہے؟"

"اگر یہ نہ ہوتا تو اچھا تھا"۔

"پر اب تو اکٹھے نہ نبھے گی"۔

"لوگ کیا کہیں گے"۔

"کہنے دو۔ ہم کر ہی کیا سکتے ہیں"۔

حکمت رائے نے آہ سرد بھر کر کہا "اس پربھو داس نے کام خراب کر دیا ورنہ ہم کبھی الگ نہ ہوتے"۔

"میرے سامنے اُس کا نام نہ لو"۔

"مجھے یہ خیال بھی نہ تھا کہ وہ ایسا فطرتی ہو گا"۔

"جی چاہتا ہے۔ اُسے گولی سے اڑا دوں"۔

"اُسے اپنی نیک دلی کا بڑا زعم ہے"۔

"دوسروں کو بالکل حقیر سمجھتا ہے۔ اب اسکے ساتھ کام کرنے کو جی نہیں چاہتا"۔

حکمت رائے نے میرے قریب ہو کر پُر معنی انداز سے کہا۔ "قریباً اسی ہزار روپیہ لے جائیگا"۔

مجھے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے کسی نے کنوئیں میں دھکیل دیا ہو۔ کلیجہ زور زور سے دھڑکنے لگا۔ کہا بالکل نالائق آدمی ہے۔ سارا کام ہم دونوں کرتے رہے ہیں حصّہ وہ بھی برابر کا لے جائیگا"۔

"اس میں کیا شُبہ ہے"۔

"میرا بس چلے۔ تو اُسے کوڑی نہ دوں"۔

"تباہی مچا دے گا۔ پانی پینا مشکل کر دیگا"۔

"کیا کوئی طریقہ نہیں"۔

حکمت رائے نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔ "پرماتما اُسے موت دے۔ تو ہمارا کام بن جائے"۔

جس طرح سانپ کا زہر آناً فاناً آدمی کے جسم میں سرایت کر جاتا ہے۔ اُسی طرح یہ الفاظ میرے دماغ پر حاوی ہو گئے۔ سوچنے لگا۔ کیا اُسے موت نہیں آسکتی دو دن اسی اُدھیڑ بن میں گذر گئے۔ تیسرے دن معلوم ہوا کہ پربھو داس بیمار ہے۔ میں زمین سے اُچھل پڑا۔ سرزمین امید قریب آتی دکھائی دی۔ حکمت رائے سے مشورہ کر کے بھاگا بھاگا ڈاکٹر کے پاس گیا۔ دیر تک تنہائی میں باتیں ہوتی رہیں۔ مگر ڈاکٹر رضامند نہ ہوتا تھا۔ میں ہارے ہوئے جوارئے کی طرح روپوں کی تعداد زیادہ کرتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ پانچہزار پر معاملہ طے ہو گیا۔ اور اُس نے

پربھو داس کی دوا میں ایک خاص قسم کا سفوف ملا دیا۔ اسوقت میں ایسا خوش تھا جیسے کسی کو ریاست مل گئی ہو۔ پربھو داس رات کو مر گیا۔ اس نے ابھی تک شادی نہ کی تھی۔ نہ اس کا کوئی قریبی رشتہ دار تھا۔ ایک دُور کے رشتہ دار نے دعویٰ کر کے حصّہ وصول کرنے کی دھمکی دی۔ مگر ہم نے کہہ دیا۔ وہ ہمارا ملازم تھا۔ شریک کار نہ تھا۔ ازراہِ ہمدردی ہم نے اسے کچھ روپے بھی دے دئے۔ ان روپوں نے اسکی زبان پکڑلی۔ پربھو داس کا روپیہ نصف میں نے لے لیا۔ نصف حکومت رائے نے اس وقت مجھے ذرا خیال نہ آیا کہ یہ گناہ ہے۔ مگر آج اسکے تصوّر ہی سے رگوں کا خون منجمد ہو جاتا ہے۔

(۴)

اس زمانہ میں میری شادی ہو چکی تھی۔ مگر اولاد کوئی نہ تھی۔ ہم دونو خاوند بیوی بیٹے کا منہ دیکھنے کو ترستے تھے۔ کبھی سادھوؤں کے ہاں جاتے۔ کبھی حکیموں کی ادویات کھاتے۔ مگر ان سے کچھ بنتا نہ تھا۔ جب روپیہ تقسیم ہو چکا۔ تو میں نے بیوی کو لے کر ہردوار کی جاترا کی۔ اور دو تین مہینے وہیں مقیم رہا۔ اس دوران میں مجھے خیال آتا تھا۔ کہ میں نے پاپ کیا ہے۔ مجھے سُکھ نہ ملے گا۔ اِس خیال سے میرا دل تڑپ جاتا تھا۔ جیسے کسی نے مچھلی کو گرم ریت پر رکھ دیا ہو۔ آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے۔ یہی چاہتا تھا۔ اگر ممکن ہو۔ تو گذرا ہُوا زمانہ لوٹا لوں۔ مگر یہ ناممکن تھا۔ تب میں اس خیال کو دل سے بُھلا دینے کی کوشش کرتا تھا۔ اور سادھو سنتوں کی خدمت کر کے بخیال خویش اپنے گناہ کے داغ کو چھپا دیتا تھا۔ کاش مجھے اس وقت ہی علم ہوتا۔ کہ یہ کام اتنا آسان نہیں۔ جتنا میں سمجھ رہا ہوں لیکن مجھے اپنے گناہ کی کوئی سزا نہ ملی۔ بلکہ اسی سال کے اندر اندر میرے ہاں ایک بیٹا پیدا ہو گیا۔ میری خوشی کا ٹھکانا نہ تھا۔ پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے

سوچتا تھا مجھ سا خوش نصیب کون ہو گا۔ دولت اور خوبصورت بیوی پہلے موجود تھے۔ اب اولاد بھی مل گئی۔ دنیا انہی تین چیزوں پر مرتی ہے۔ مجھے تینوں میسر تھیں کاروبار شروع کیا۔ اس میں بھی کامیابی ہوئی۔ اب گناہ کا خیال نہ آتا تھا۔ دنیا کی فانی کامیابیوں اور چند روزہ خوشیوں نے اسے نگاہ سے اوجھل کر دیا تھا نیکی دنیا کا نور ہے۔ یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ دنیا میں گناہ پھیلتا ہے۔ البتہ اسکی تصدیق ہو گئی۔ جوں جوں بیٹا بڑا ہوتا گیا۔ امید اپنا دامن دراز کرتی گئی۔ پہلے اسکی تعلیم کا انتظام گھر پر کیا۔ بعد میں سکول بھیجنا پڑا۔ اسکی طبیعت میں سادگی اور معصومیت تھی۔ چہرے پر بھولا پن کھیلتا تھا۔ جو دیکھتا۔ کہتا۔ بڑا بھاگوان لڑکا ہے۔ ماں باپ کا نام روشن کرے گا۔ میں یہ سنتا۔ تو خوشی سے جھومنے لگ جاتا مگر بعض وقت کسی نامعلوم خوف کے احساس سے دل پر بار سا آپڑتا۔ جیسے کوئی کلیجہ پر پتھر رکھ دیتا ہے۔

اسی طرح بیس سال گذر گئے۔ بنسی لال نے بی۔ اے کا امتحان پاس کر لیا۔ اور لا کالج میں داخل ہوا۔ میں یہ دیکھتا تھا۔ اور خوش ہوتا تھا۔ سوچتا تھا۔ ایک دو سال کی بات ہے۔ بنسی لال وکیل ہو جائیگا۔ اسکے بعد جج ملنا مشکل نہیں۔ اس خیال سے دل مسرور یہ جذبہ کا عالم طاری ہو جاتا تھا۔ ان دنوں کو آج بھی یاد کرتا ہوں۔ تو آنکھوں سے خون کے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ میری زندگی چاندنی رات سے مشابہ تھی۔ جس میں رقص و سرود کی محفل آراستہ ہو۔ معاً نوائے نغمہ میں صدائے درد بلند ہوئی۔ میری بیوی کو بخار آنے لگا۔ یہ بخار کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ احتیاط سے علاج ہونے لگا۔ مگر ایک ماہ گذر گیا۔ تب بھی افاقہ نہ ہوا۔ دوسرا اور تیسرا مہینہ بھی اسی طرح نکل گیا۔ در بخار نہ اترا۔ اب تو مجھے بھی تشویش ہوئی۔ لاہور لے جا کر علاج کرنے کا ارادہ کیا۔ اس زمانہ میں پنجاب میں ڈاکٹر ہنری وُڈ کی قابلیت کے ڈنکے

بجھتے تھے۔ اُسے دکھایا اُس نے بہت غور سے تشخیص کی۔ اور مجھ سے تنہائی میں کہا "تپ دق ہے۔ اب نہ بچے گی"

یہ سن کر میرے ہوش اڑ گئے۔ ایسا معلوم ہوا۔ جیسے آسمان سر پر گر پڑے گا ڈاکٹر کی بات کا یقین نہ ہوا۔ حیرت سے بولا "تپ دق ہے کیا؟"

"ہاں تپ دق۔ شاید بچ جائے۔ نسخہ لکھے دیتا ہوں۔ مگر کوئی امید نہیں"

میں نے پوچھا "اگر کسی پہاڑ پر لے جاؤں۔ تو کیسا ہو"

"زندگی ذرا لمبی ہو سکتی ہے۔ مگر بیماری نہ جائیگی"

"ڈاکٹر صاحب! آپ سے جو کچھ ہو سکتا ہے۔ کیجئے"

میری آنکھوں میں آنسو تھے۔ الفاظ میں حسرت۔ ڈاکٹر صاحب نے ازراہِ کرم کہا "میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا۔ مگر آپ یہ بات مریض پر ظاہر نہ ہونے دیں"

لیکن یہ بات اُسے معلوم ہو گئی۔ پتہ نہیں کس طرح؟ ایک دن اُس نے مجھ سے روتے روتے کہا "میرے مرنے میں اب زیادہ دن نہیں۔ اب منسی کا بیاہ کر دو۔ میں یہ حسرت دل میں نہ لیجاؤں"

اور میں نے اس کی یہ خواہش پوری کر دی۔ اسی مہینے منسی کا بیاہ ہو گیا۔ اور اس کے بعد ہم سب مولن چلے گئے۔ امید آخری دم تک ساتھ نہیں چھوڑتی۔

(۵)

مگر وہ نہ بچی۔ چھ ماہ کے بعد اُسکا چراغِ زندگی ظالم موت کے بے رحم جھونکے نے بجھا دیا۔ مجھ پر مصیبت ٹوٹ پڑی اور منسی کی تو حالت نہ دیکھی جاتی تھی۔ کسی بیاہے ہوئے لڑکے کو اپنی ماں سے ایسی محبت ہو سکتی ہے یہ میرے لئے نیا تجربہ تھا۔ پھوٹ پھوٹ کر روتا تھا۔ میں اُسے سمجھاتا تھا۔ تسلی دیتا تھا۔ مگر اسکا رونا کم نہ ہوتا تھا۔

اسکا غمگین چہرہ دیکھ کر مجھے اپنا غم بھول جاتا تھا۔ مجھے کوئی ایسا دن یاد نہیں۔ جب بنسی ماں کو یاد کر کے نہ رویا ہو۔ کبھی وہ کتاب کا کیڑا تھا۔ مگر اب کتاب دیکھنے کو اُسکا جی نہ چاہتا تھا۔ ہارمونیم کا شوق تھا وہ بھی نہ رہا۔ دن رات اُداس رہنے لگا۔ میرے دل میں نئے اندیشے پیدا ہوئے۔ میں نے اسکا دل بہلانے کی ہر ایک کوشش کی۔ مگر مجھے کامیابی نہ ہوئی۔ لوگ اپنے بیٹوں کی شکایت کرتے ہیں۔ کہ انہیں والدین سے محبت نہیں۔ میں چاہتا تھا۔ کاش بنسی لال میں یہ عیب ہوتا۔ تو مجھے یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ مگر جو قسمت میں بدا ہو۔ اُسے کون مٹا سکتا ہے بنسی لال بیمار رہنے لگا۔

اتنے میں معلوم ہوا۔ میرا کاروبار تباہ ہو گیا ہے۔ جس کارندے کے ہاتھ میں میں نے سیاہ و سفید سونپ رکھا تھا۔ اس نے مجھے دغا دیا۔ اور دو ڈھائی لاکھ روپیہ اُڑا کر بھاگ نکلا۔ یہ سن کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ بنسی لال اور اسکی بیوی کو سولن چھوڑ کر جہلم پہنچا۔ مگر وہ آدمی کہاں تھا اخبارات میں اشتہار دیئے۔ پولیس میں رپورٹیں کیں۔ مگر وہ آدمی گرفتار نہ ہو سکا نہ ڈوبا ہوا روپیہ بچا۔ میں نے کاروبار کو سنبھالنے کی بیحد کوشش کی۔ مگر وہ نہ سنبھلا۔ حالات دن بدن زیادہ خراب ہوتے گئے۔ جس کام میں ہاتھ ڈالتا تھا۔ اس میں نقصان ہو جاتا تھا۔

اسی طرح چار مہینے گذر گئے اور بنسی لال اور اسکی بیوی سولن سے آئے۔ اسکی شکل دیکھ کر میرا دم لبوں تک آ گیا۔ میں ڈاکٹر نہیں ہوں۔ نہ میں نے طب کی کوئی کتاب دیکھی ہے۔ مگر میں نے اپنی بیمار بیوی کی حالت دیکھی تھی۔ مجھے بنسی لال کے چہرے پر وہی آثار نظر آئے۔ جو میری مرحوم بیوی کے چہرے پر تھے۔ میرے کلیجے پر جیسے کسی نے انگارے رکھ دیئے۔ میں نے بنسی لال سے کچھ نہ کہا۔ مگر اپنے

کمرے میں جاکر ساری رات روتا رہا۔ دوسرے دن ڈاکٹر کو دکھایا۔ میرے اندیشے مادی صورت اختیار کرنے لگے۔ ماں کے بعد بیٹے کی بھی باری تھی۔

پھر تپ دق۔ میرا دماغ کھولنے لگا۔ مگر میں نے عزم کرلیا۔ کہ اپنی بچی کھچی دولت لٹادوں گا۔ ڈاکٹر کی ہدایات پر حرف بحرف عمل کروں گا۔ احتیاط میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھوں گا۔ اور اس طرح بیٹے کو موت کے پنجوں سے چھڑالوں گا۔ میں بنسی اور اسکی بیوی کو لے کر سولن چلا گیا۔ لیکن بیماری میں افاقہ نہ ہوا۔ ڈاکٹروں نے رائے دی۔ کہ اسے سوئٹزرلینڈ کے سینی ٹوریم میں لے جاؤ۔ وہاں جاکر بچ سکتا ہے میرے پاس پندرہ ہزار کے قریب روپیہ بچ رہا تھا۔ یہ روپیہ مجھے بہت عزیز تھا مگر بنسی لال کے مقابلہ میں اسکی کوئی حقیقت نہ تھی۔ میں نے اُسے سوئٹزرلینڈ بھیج دیا۔

وہ وہاں دو سال رہا۔ اس عرصہ میں اسکی صحت میں نمایاں ترقی ہوئی۔ یہاں تک کہ طبّی بورڈ نے فیصلہ دیدیا کہ اسے اب کسی قسم کا خطرہ نہیں۔ اِس اطلاع سے مجھے بیحد خوشی ہوئی۔ سارا دن ناچتا پھرا۔ بنسی لال نے اپنا فوٹو بھی بھیجا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا۔ کہ اسکی صحت پہلے کی نسبت بہت عمدہ ہے۔ چہرہ بھی بھر گیا تھا۔ اب میں اس لمحہ کا منتظر ہوا۔ جب وہ واپس آئے۔ اور میں اُسے محبّت پدری سے گلے لگاؤں۔ مگر جب وہ دن آیا۔ تو میری امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ بنسی لال ہندوستان آگیا۔ مگر اپنی صحت وہیں چھوڑ آیا۔ اگر میرے پاس اور روپیہ ہوتا تو میں اُس سے دریغ نہ کرتا۔ مگر میری حالت دن بدن خراب ہو رہی تھی۔ میں نے اپنی طرف سے پوری پوری کوشش کی کہ کہیں سے روپیہ مل جائے۔ مگر میری سعی مشکور نہ ہوئی۔

---

(۶)

چھ ماہ گذر گئے۔

صبح کا وقت تھا۔ مَیں بنسی لال کے پاس بیٹھا۔ اُسکے منہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آج اُسکی حالت زیادہ نازک تھی۔ نہ چہرے پر سرخی تھی۔ نہ آنکھوں میں رونق۔ ان پر لاش کی سی زردی نے قبضہ کر لیا تھا۔ مَیں یہ دیکھتا تھا۔ اور روتا تھا۔ اسوقت میری ساری زندگی میری نگاہوں کے سامنے تھی۔ وہ دن یاد آ گئے۔ جب میں نے سٹھائی کا خوانچہ چھوڑ کر بیوپار شروع کیا تھا۔ پاس دولت نہ تھی۔ مگر دل میں اطمینان تھا۔ اب وہ دن کہاں تھے۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دیکھا تو اس وقت میرے پاس صرف ڈیڑھ سو روپیہ تھا۔ میں چونک پڑا۔ بھولے ہوئے واقعات آنکھوں تلے پھر گئے۔ اسی قدر روپوں سے مَیں نے بیوپار شروع کیا تھا۔ اُسوقت نہ بیوی تھی نہ بیٹا۔ کیا قدرت مجھے آج اُسی جگہ پھینکنے کا انتظام کر رہی ہے۔ بیوی پہلے جا چکی تھی۔ بیٹا اب رخصت ہو رہا تھا

یکایک بنسی لال نے زور سے انگڑائی لی۔ اور چارپائی پر تڑپنے لگا۔ میں نے دل کو آخری صدمہ کے لئے تیار کیا اور اُٹھ کر مرنے والے کے اوپر جھک گیا وہ کرب کی حالت میں تھا۔ مَیں نے بھرّائی ہوئی آواز سے کہا "بنسی!"

بنسی نے بیہوشی میں جواب دیا "ہاں"

"ہوش کرو"

"ہاں ہوش میں ہوں"

"مَیں کون ہوں؟"

بنسی لال نے میری طرف غور سے دیکھا اور کہا "میرا شریکِ کار"

اگر میرے گلے سے سانپ لپٹ جاتا۔ تب بھی مجھے ایسی حیرت نہ ہوتی جیسی

اِس جواب سے ہوئی۔ دِل پر وحشت کا غلبہ ہوگیا۔ جیسے کسی نے پھانسی کے تختہ پر چڑھا دیا ہو۔ مگر پھر مجھے خیال آیا۔ بنسی بیہوش ہے یونہی بڑ ہانک گیا ہے۔ اس لئے مَیں نے پھر کہا۔

"بنسی"

"ہاں"

اب آواز میں زیادہ نقاہت تھی۔

"یہ کون ہے؟"

اشارہ اُس کی بیوی کی طرف تھا۔

بنسی نے اپنی پتھرائی ہوئی آنکھیں اپنی بیوی کی طرف اٹھائیں اور کہا "ڈاکٹر"

شُبہ یقین بن گیا۔ میں کھڑا نہ رہ سکا۔ میرے پاؤں کی طاقت جیسے زمین نے غصب کرلی۔ گناہ کا انجام ایسا حسرت آفرین۔ ایسا دل سوز ہوگا۔ یہ توقع نہ تھی۔ میں نے تناسخ کے افسانے سُنے تھے۔ مگر اُن پر اعتبار نہ تھا۔ اسوقت زندہ ثبوت مِلگیا۔

بنسی مرگیا۔ مگر میری آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔ اُنہیں گناہوں کی آگ نے خشک کردیا تھا۔ مَیں نے اُسکا آخری سنسکار کیا۔ اور جہلم سے نکل آیا۔ اُس کے بعد میں نے آج تک وہاں قدم نہیں رکھا۔

اب مَیں ہر روز اپنے جسم کو تکلیفیں دیتا ہوں کوڑے مارتا ہوں۔ دِن رات عبادت کرتا ہوں۔ اور ہر ایک کو یہ کہانی سناتا ہوں اور پھر لوگوں کے سامنے سر جُھکا کر اُن سے درخواست کرتا ہوں کہ میرے سر پہ پانچ پانچ جوتے لگادو۔ شاید اسی سے میرا گناہ دُھل جائے۔"

یہ کہتے کہتے سادھو نے اپنا سر نیچے جُھکا دیا۔

"مرزا مغل کی بیٹی"

(از حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی)

غدر ۱۸۵۷ء میں جب باغی فوجوں نے بہادر شاہ بادشاہ کے مضبوط و بہادر لڑکے مرزا مغل کو اپنا کمانڈر انچیف بنا لیا۔ اور مرزا مغل عملاً باغیوں کی سرداری کے کام انجام دینے لگے۔ تو ایک دن ۴۹ انگریز عورت مرد، بچے بوڑھے دہلی کے لال قلعہ میں باغی فوج کی شرارت سے قتل کئے گئے۔ جس وقت ان انگریز مردوں عورتوں اور بچوں کو دیوان خاص کے سامنے قتل کرنے کے لئے کھڑا کیا گیا تو مرزا مغل اپنے مکان کی چھت پر کھڑے ہوئے مقتل کا نظارہ دیکھ رہے تھے۔ اس وقت اُن کی آٹھ برس کی لڑکی نرگس نظر نام بھی پاس کھڑی تھی۔ اُس نے جب دیکھا کہ انگریزوں کے بچے بھی قتل گاہ میں لا کر کھڑے کئے گئے اور اُن بچوں نے بلبلا کر رونا شروع کیا۔ اور ان کی مائیں گھٹنے ٹیک کر خدا سے پناہ مانگنے لگیں۔ اور انہوں نے اپنے بچوں کو چھاتی سے لگا کر زار و قطار رونا شروع کیا۔ تو اس وقت کوئی آدمی ایسا نہ تھا جس کی آنکھ سے آنسو جاری نہ ہوں۔ مرزا مغل کے چند مصاحب جو ان کے پاس کھڑے تھے خصوصاً اُن کی لڑکی نرگس نظر کے استاد مولینا عین اللہ صاحب آنکھوں میں آنسو بھر کر بولے۔ "صاحب عالم یہ تو بڑی سفاکی کا کام ہے۔ عورتوں اور بچوں کا قتل کسی مذہب میں روا نہیں ہے۔ اور اسلام نے تو سختی سے اسکی ممانعت ہے۔ للہ آپ فوج کو حکم دیجے کہ وہ ان عورتوں اور بچوں کو قتل نہ کرے۔ مغل نے جواب دیا۔ کہ بیشک یہ بہت بڑے ظلم و ستم کی بات ہے۔ مگر فوج جاہل سپاہیوں اور غصہ میں بھرے ہوئے افسروں کو روکنا اور اس بُرے

سے باز رکھنا آسان نہیں ہے۔ یہ لوگ بالکل جنگلی اور وحشی ہیں۔ اور انگریزوں سے باغی ہونے کے بعد اتنے خودسر ہو گئے ہیں۔ کہ کسی شخص کا حکم نہیں مانتے جو جی میں آتا ہے کرتے ہیں۔

مولانا عین اللہ صاحب نے کہا "صاحب عالم کو تو انہوں نے اپنا بڑا سپہ سالار بنا لیا ہے اور جہاں پناہ ظلّ سبحانی اعلیحضرت بادشاہ سلامت کو یہ اپنا حکمران تسلیم کر چکے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ یہ آپ کا یا آپ کے والد بادشاہ سلامت کا حکم نہ مانیں آپ کو اس بات کی ضرور کوشش کرنی چاہئے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں۔ کہ ان انگریز عورتوں اور بچّوں کے رونے اور آہ وزاری کرنے سے آسمان وزمین کانپتے ہوئے نظر آئے ہیں"

مرزا مغل نے جواب دیا۔ مولینا میں اور میرے والد نام کے کھلونے بنا دئے گئے ہیں۔ ورنہ اصل حقیقت یہ ہے کہ نہ میرا کوئی کہنا مانتا ہے نہ بادشاہ سلامت کا۔ جب یہ انگریز عورت مرد گرفتار ہو کر آئے تو میں نے اسی مصلحت سے قلعہ میں حضرت بادشاہ سلامت کے پاس بھجوا دیا تھا۔ کہ کسی صورت سے ان عورتوں اور بچّوں کی جان بچالوں۔ مگر ان ظالم باغیوں نے قلعہ کے اندر بھی ان بیچارے انگریز عورتوں اور مردوں کو اپنی گرفت کے اندر رکھا۔ اور بادشاہ سلامت کے اثر کو کسی طرح قبول نہ کیا۔ یہاں تک کہ جب میرے کہنے سے دو ایک مرتبہ بادشاہ سلامت نے نہایت مکلّف کھانے ان بیکس قیدیوں کو اپنے خاصے سے بھجوائے تو باغی مزاحم ہوئے اور وقت کے ساتھ ان قیدیوں کو وہ کھانا دینے پر رضامند ہوئے۔ اُن کا خیال تھا کہ بادشاہ سلامت اور ان کی اولاد انگریزوں سے ملی ہوئی ہے۔ چنانچہ اُن کے اکثر منہ پھٹ سپاہیوں نے میرے اور جہاں پناہ بادشاہ سلامت کے مُنہ در مُنہ کہا کہ ہم نے اپنی جانوں کو اور سارے گھر بار کو تباہی میں ڈال دیا ہے۔ مگر آپ اس کی کچھ قدر نہیں کرتے۔ اور بات بات میں انگریزوں کی رعایت کرتے ہیں۔ اگر آپ لوگ ہم

سے باز نہ آئے تو پہلے ہم آپ سب لوگوں کا تلوار سے صفایا کر دینگے۔ مولانا ہمیں انصاف کرو۔ ایسی جنگلی اور وحشی فوج سے کیونکر سفارش کی جا سکتی ہے۔ اگر اس وقت میں ان لوگوں کو عورتوں اور بچّوں کے قتل سے منع کروں تو یہ پہلے مجھ کو اور میرے بچّوں کو اسی مقام پر لیجا کر قتل کر دیں گے۔ جہاں ان بیچارے انگریز قیدیوں کو ہلاکت کے ارادے سے لے کر گئے ہیں۔

مولانا عین اللہ صاحب نے فرمایا "صاحب عالم کی یہ مجبوری حق بجانب ہے مگر اسلام حکم دیتا ہے کہ مظلوم کی حمایت کے لئے اپنی جان کی کچھ پروا نہ کرنی چاہیئے۔ دنیا چند روزہ ہے۔ چلیئے آپ میرے ساتھ چلیئے۔ میں خود جا کر ان باغیوں کو نصیحت کروں گا۔ مرزا مغل نے اسکا کچھ جواب تو نہ دیا۔ مگر ان کے چہرہ کے تذبذب اور سکوت سے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ اس خیال پر کچھ آمادہ ہونا چاہتے ہیں۔ مگر قبل اس کے کہ وہ ایک لفظ اپنی زبان سے نکالتے۔ ایک شخص نے جو مرزا کے مصاحبوں کے پیچھے کھڑا تھا۔ دوڑ کر مولانا عین اللہ صاحب کی پیٹھ میں ایک چھری ماری۔ اور اُلٹے پاؤں یہ کہتا ہوا بھاگا۔ کہ کافروں کے دوستوں کی یہ سزا ہے۔ مرزا مغل کے مصاحب اور خود مرزا مغل مولانا عین اللہ کو سنبھالنے لگے اور دو ایک آدمی قاتل کے پیچھے دوڑے تاکہ اسکو گرفتار کرلیں۔ مگر قاتل کوٹھے سے نیچے اُتر کر دوڑا ہوا باغی سپاہیوں کے جھرمٹ میں جا کر چھپ گیا۔

چھری مولانا عین اللہ کے بائیں پہلو پر لگی تھی جس نے پسلیوں کو چیر کر دل کے دو ٹکڑے کر دئے اور بیچارے مولانا گرتے ہی رحلت کر گئے۔ اور ایک بات بھی ان کے منہ سے نہ نکلنے پائی۔

نرگس نظر گو بچہ تھی۔ مگر اپنے استاد کا یہ حال دیکھ کر پہلے تو کچھ خوف زدہ ہو گئی۔ اور اس کے بعد ہائے میرے والد مولوی صاحب کہہ کر رونا شروع کر دیا۔

(۲)

باغی فوجیں بھاگ گئیں۔ انگریزی فوج نے دہلی فتح کر لی۔ بہادر شاہ بادشاہ ہمایوں کے مقبرے میں گرفتار ہو گئے۔ مرزا مغل مرزا بوبکر وغیرہ فاتح فوج کے ہاتھوں اسیر ہو کر قتل کر دئے گئے۔ اس وقت نرگس نظر اپنی والدہ کے ساتھ جو مرزا مغل کی ایک منظور نظر لونڈی تھی۔ بیل گاڑی میں سوار جنگل میں جا رہی تھی۔ گاڑی میں ایک نرگس نظر ایک اسکی ماں اور ایک خانم نام کی مامائیں عورتیں تھیں اور دو مرد مردوں میں ایک مرزا گھسیٹا تھے۔ جن کی دور کی قرابت شاہ عالم بادشاہ سے ہوتی تھی۔ اور دوسرے مرزا مغل کی ڈیوڑھی کے داروغہ قدرت خاں تھے۔ گاڑی قطب صاحب کی درگاہ سے آگے بڑھ کر چھتر پور کے قریب پہنچی تھی کہ سامنے سے چند سوار آتے ہوئے نظر آئے۔ ان لوگوں نے سمجھا کہ انگریزی فوج آ گئی اس واسطے انہوں نے گاڑی کو راستہ سے بالکل ہٹا لیا۔ اور چاہا کہ درختوں کی آڑ میں چھپ جائیں۔ مگر گاڑی دس قدم بھی نہ بڑھنے پائی تھی کہ سوار قریب پہنچ گئے۔ اور انہوں نے گاڑی کو گھیر لیا۔ نرگس نظر نے دیکھا۔ کہ ان سواروں میں وہ شخص بھی ہے جس نے مولانا عین اللہ کو شہید کیا تھا۔ اسوقت اس نے چپکے سے اپنی ماں کے کان میں کہا۔ یہ انگریزی فوج نہیں ہے۔ بلکہ باغی فوج ہے۔ سواروں نے گاڑی کو روک لیا۔ اور کہا جو کچھ مال تمہارے پاس ہو۔ ہمیں دے دو۔ مرزا گھسیٹا نے ایک باغی سپاہی کو پہچان کر کہا۔ تم کو تو ہماری مدد کرنی چاہیئے۔ نہ کہ الٹا ہم کو لوٹو۔ اس پر مولانا عین اللہ کے قاتل نے کہا۔ تم لوگ مدد کے قابل نہیں ہو۔ کیونکہ تمہاری مخبریوں نے انگریزوں کو فتح دلوائی اور ہم کو بھاگنا پڑا۔ داروغہ قدرت خاں نے جواب دیا۔ بالکل جھوٹ ہے۔ تمہیں لوگوں نے ہماری اطاعت نہ کی۔ اور اتنی بڑی طاقت کے باوجود بھاگ کھڑے ہوئے۔ اور ہمارا عیش آرام اور گھر بار برباد کر دیا۔ یہ فقرہ سن کر باغی سوار بیتاب ہو گئے۔ اور غصہ تک ہو کر انہوں

نے گاڑیبان اور مردوں پر تلواریں مارنی شروع کیں۔ چنانچہ مرزا گھسیٹا۔ داروغہ قدرت خاں اور گاڑیبان اسی جگہ مارے گئے۔ اور بیچاری خانم بھی قدرت خاں کے بچانے میں تلوار کھا کے گر پڑی اور جان سے گئی۔ صرف نرگس نظر اور اسکی ماں زندہ بچیں باغیوں نے گاڑی کا سب اسباب لوٹ لیا۔ یہاں تک کہ مقتولوں کے کپڑے بھی اتار لیے۔ نرگس نظر کی والدہ کے پاس جتنا زیور تھا۔ وہ بھی چھین لیا اور نرگس نظر کے کانوں میں اور گلے میں جو گہنا تھا۔ وہ بھی زبردستی اُتار لیا۔ اسکے بعد وہ آپس میں مشورہ کرنے لگے۔ کہ ان دونوں کو کون لے۔ ایک سوار نے کہا "عورت جوان ہے اس سے میں شادی کروں گا۔ اسکو مجھے دیدو۔ اور اسکے عوض میرے حصہ کا زیور لے لو۔ مولانا عین اللہ کا قاتل بولا۔ اس لڑکی کو میں لوں گا۔ کیونکہ میرے کوئی اولاد نہیں ہے۔ چنانچہ اس مشورہ پر عمل کیا گیا۔ اور نرگس نظر کی والدہ کو ایک سوار نے اپنے گھوڑے پر بٹھالیا اور نرگس نظر کو مولانا عین اللہ کے قاتل نے اپنے گھوڑے پر سوار کر لیا۔ نرگس نظر "اماں اماں" کہہ کر رونے لگی۔ تو نرگس نظر کی ماں نے اس سوار سے کہا۔ کہ میری لڑکی کو بھی تو لے لے۔ تاکہ ہم دونوں آپس میں ایک جگہ رہیں۔ اس سوار نے کہا میں بھرت پور کا رہنے والا ہوں۔ اور وہاں تجھ کو لے کر جاؤں گا۔ اور یہ سوار جس کے حصے میں تیری لڑکی ہے۔ سوہنہ ضلع گوڑگانوہ کا رہنے والا ہے۔ ہم اپنے آپس کی تقسیم کو بدلنا نہیں چاہتے۔ نرگس نظر کی ماں نے کہا۔ للہ مجھ پر رحم کرو۔ اور میری اکلوتی بچی کو مجھ سے نہ چھڑاؤ۔ مگر ان ظالموں کو ذرا رحم نہ آیا۔ اور بھرت پوری سوار نرگس نظر کی ماں کو لیکر بھرت پور چلا گیا۔ اور مولانا عین اللہ کا قاتل نرگس نظر کو لئے ہوئے سوہنہ پہنچ گیا۔

(۳)

نرگس نظر کا بیان ہے۔ کہ جب میری والدہ مجھ سے جُدا ہو کر چلیں۔ تو وہ اپنے

بال نوچتی تھیں اور ڈھاڑیں مار مار کر روتی تھیں۔ اور میں بھی "اماں اماں" کہہ کر چیختی تھی۔ مگر ان ظالموں کو ہم میں سے کسی کی فریاد پر بھی رحم نہ آتا تھا۔ مجھ کو جب تک ماں کا گھوڑا نظر آتا رہا۔ ان کو چیخ چیخ کر پکارتی رہی۔ لیکن جب گھوڑا آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ تو میں چپ ہو گئی۔ سوہنے میں پہنچ کر وہ شخص مجھ کو اپنے مکان میں لے گیا۔ وہ ذات کا گھوسی تھا۔ اسکے گھر میں تین چار بھینسیں بندھی ہوئی تھیں۔ اسکی بیوی نے جب مجھ کو دیکھا اور خاوند سے یہ سنا۔ کہ وہ مجھ کو بیٹی بنانے کے لئے لایا ہے۔ تو وہ بہت خوش ہوئی۔ اور اس نے مجھ کو بہت پیار و محبت سے اپنے پاس بٹھایا۔ آٹھ دن تک اس گھوسن نے میری ایسی خاطر کی کہ میں اپنی ماں کی جدائی کے غم کو بھول گئی آٹھ دن کے بعد یکایک انگریزی فوج کی ایک دوڑ آئی۔ اور اس نے میرے موجودہ باپ کو پکڑ لیا۔ اور گھر کا تمام مال و اسباب ضبط کر کے لے گئی۔ مجھ کو میری گھوسن ماں نے بہت تسلی دی۔ اور پڑوس کے ایک شخص کے ہاں لے کر چلی گئی۔ تین روز کے بعد ہم نے سنا کہ وہ گھوسی بغاوت کے جرم میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ اور اسکا تمام مال و اسباب نیلام ہو گیا۔ وہ بیچاری گھوسن بھاگتے وقت کچھ نقدی اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ جس سے وہ دو سال تک اپنا گذارہ کرتی رہی۔ اور میری دلداری میں اس نے کسی قسم کی کمی نہیں کی۔

ایک روز رات کو ہمارے گھر میں چور آئے۔ اور انہوں نے میری گھوسن ماں کے گلے سے ہنسلی اتارنی چاہی۔ گھوسن ماں کی آنکھ کھل گئی۔ اور اس نے غل مچا دیا۔ اس پر چوروں نے گھوسن ماں کا گلا گھونٹ دیا۔ اور وہ بیچاری اس صدمہ سے مر گئی۔

گھوسن ماں کے مرنے کے بعد ایک دو دن تک مکان والوں نے مجھ سے کچھ نہ کہا۔ بلکہ تسلی و تشفی سے پیش آتے رہے۔ مگر تین دن کے بعد اس مکان والے کی بیوی نے کہا۔ کہ اری تو دن بھر بیٹھی رہتی ہے کچھ کام کیوں نہیں کرتی۔ ہمارے ماں مفت کی

روٹی نہیں ہے۔ خدمت کرے گی تو کھانے کو ملیگا میں نے کہا مجھے تم کام بتاؤ۔ تم جو کچھ کہوگی۔ میں وہی کروں گی۔ اس عورت نے کہا۔ گھر میں جھاڑو دیا کر۔ بھینسوں کا گوبر اُٹھایا کر اور ان کے اُپلے تھاپا کر۔ میں نے جواب دیا۔ اُپلے تھاپنے تو مجھ کو نہیں آتے۔ جھاڑو بھی میں نے کبھی نہیں دی۔ یہ کام میں نے کبھی نہیں کئے میں ہندوستان کے بادشاہ کی پوتی ہوں۔ مگر خدا نے یہ وقت مجھ پر ڈالا ہے۔ تو جو کام تم کہوگی وہی کروں گی۔ دو چار دفعہ مجھ کو یہ کام کرکے بتاؤ۔ تاکہ میں سیکھ جاؤں۔ وہ عورت بڑی نرم مزاج تھی۔ اس نے مجھ کو جھاڑو دینی اور اُپلے تھاپنے سکھائے۔ اور میں یہ کام کرنے لگی۔

ایک دن مجھ کو شدّت کا بخار تھا۔ اور اسکی تکلیف کے سبب مجھ سے اُپلے نہ تھاپے گئے۔ اس عورت کا خاوند گھر میں آیا۔ اور مجھ کو پڑا ہُوا دیکھا۔ تو اُس نے میرے ایک ٹھوکر ماری اور کہا دس بج گئے۔ تو اب تک پڑی سوتی ہے یہ لال قلعہ نہیں ہے گھوسی کا گھر ہے۔ اُٹھ کر بیٹھ اور گوبر تھاپ۔

گھوسی کے ٹھوکر مارنے سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں اُٹھ بیٹھی اور کہا مجھ سے خطا ہوگئی میں ابھی گوبر تھاپتی ہوں۔ چنانچہ میں نے اُسی بخار کی حالت میں جھاڑو بھی دی۔ اور اُپلے بھی تھاپے۔ اسوقت تو مجھے اتنی سمجھ تھی۔ مگر آج جب مجھے اِس مصیبت کا دھیان آتا ہے۔ تو دل بیچین ہوجاتا ہے۔ اور میں سوچتی ہوں۔ کہ اِن کمبخت ظالم باغیوں کی بدولت ہم لوگوں کو کیسی کیسی بپتا سہنی پڑی۔ ہم اس محل کے رہنے والے تھے جس کے اندر کا تصوّر شاعروں سے عجیب وغریب نظمیں لکھواتا تھا۔ اور جہاں یہ شعر لکھا ہُوا تھا ؎

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمین است و ہمین است و ہمین است

مگر مصیبت نے یہ دن دکھایا تھا کہ ہم محلوں سے نکل کر در بدر کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے تھے۔ اور اُپلے تھاپتے تھے۔

دو سال اسی مصیبت میں گذرے۔ آخر اس گھوسن نے اپنے بھائی کے ساتھ میری شادی کر دی۔ جہاں میری ساری عمر بسر ہوئی۔

میں نے گھوسیوں کی زندگی میں جان بوجھ کر کبھی قلعہ اور اسکی بادشاہی کا خیال نہیں کیا۔ مگر میں مجبور تھی کہ دل ہر روز بچپن کا وقت یاد دلاتا تھا۔ اور سوتے میں بھی دیکھا کرتی تھی۔ کہ میرے والد مرزا مغل مسند پر بیٹھے ہیں۔ میں ان کے زانو پر سر رکھے لیٹی ہوں۔ لونڈیاں چنور ہلا رہی ہیں۔ اور دنیا مجھ کو بہشت کا ٹکڑا معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جب آنکھ کھلتی تھی۔ تو ٹوٹے ہوئے چھپر ایک چکی ایک چرخہ اور تین چار پائیوں اور تین بھینسوں کے سوا گھر میں کچھ بھی نظر نہ آتا تھا۔

اب اگر کوئی مجھ سے پوچھے۔ کہ کیا تم مرزا مغل کی بیٹی نرگس نظر ہو؟ تو میں صاف کہہ دوں گی کہ نہیں۔ میں تو ایک غریب گھوسن ہوں۔ کیونکہ آدمی کی ذات وہی ہے۔ جس کام کو وہ اسوقت کرتا ہو۔

(کہکشاں)

جلاوطن

(روس کے شہرۂ آفاق مصنف لیوٹالسٹائی کے ایک شاہکار کا ترجمہ)

ڈاکٹر غلام عبّاس صاحب ایم۔ اے پروفیسر گورنمنٹ کالج گجرات

اکسنیف شہر ولیڈی میر کا ایک نوجوان سوداگر تھا۔ اس کی کل ملکیت ایک مکان اور چند دکانیں تھیں۔ اسکے چہرے کی رنگت سُرخ اور بال گھونگریالے تھے۔ وہ نہایت زندہ دل اور موسیقی کا ماہر تھا۔ شادی کرنے سے پہلے وہ اِس کثرت سے شراب پیا کرتا تھا۔ کہ مدہوش ہو جایا کرتا تھا۔ لیکن شادی کے بعد اُس نے شراب چھوڑ دی تاہم کبھی کبھی پی لیا کرتا تھا۔

ایک دفعہ موسم گرما میں اکسنیف نیز ہنی (روس کے ایک قصبے کا نام ہے) ایک مشہور تہوار پر جا رہا تھا جب وہ رخصت ہونے لگا۔ تو اسکی بیوی بولی ــــ وہ اکسنیف! پیارے آج نہ جاؤ۔ میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔ تم پر کوئی آفت نازل ہوگی۔

اکسنیف اپنی بیوی کی اس بات پر ہنسا۔ اور کہنے لگا "تم ہمیشہ ڈرتی رہتی ہو کہ میں میلے میں شراب پیوں گا" اِسکی بیوی نے جواب دیا "میں خود بھی نہیں جانتی کہ میں کس بات سے ڈرتی ہوں۔ لیکن میں نے ایسا عجیب خواب دیکھا ہے کہ جیسے تم قصبے سے گھر آرہے ہو۔ اور تم نے اپنی ٹوپی اُتاری ہے تو میں دیکھتی ہوں کہ تمہارے سر کے بال سفید ہیں"

اکسنیف پھر ہنسا "اس سے مراد خوشی ہے .... لو اب میں جا رہا ہوں اور تمہارے لیے اچھی اچھی چیزیں لاؤں گا"

اس نے الوداع کہی اور چلا گیا۔ جب اس نے آدھا راستہ طے کر لیا۔ تو اُسے اپنا ایک واقف سوداگر ملا۔ جو اسی تہوار پر جا رہا تھا۔ دونوں رات بسر کرنے کے لئے ایک سرائے میں ٹھہر گئے اور اکٹھے ہی بیٹھ کر چائے پی۔ اور پھر دو ایسے کمروں میں جن کے درمیان صرف ایک دیوار حائل تھی۔ سونے کے لئے چلے گئے۔ اکسینیف زیادہ دیر نہیں سویا۔ وہ آدھی رات کے وقت جاگ اٹھا۔ اور اس خیال سے کہ ٹھنڈے ٹھنڈے آسانی سے سفر کر سکیگا۔ اس نے اپنے کوچوان کو جگا کر گاڑی تیار کرنے کے لئے کہا۔ اور سرائے کے مالک کا حساب بیباق کر کے روانہ ہو گیا۔ جب اس نے ساڑھے چھبیس میل کی مسافت طے کر لی۔ تو وہ پھر ستانے اور کچھ کھانے پینے کے لئے ٹھہر گیا۔ اور سرائے کی ڈیوڑھی میں آرام کیا۔ جب دوپہر کا وقت ہوا۔ تو وہ اندر گیا اور چائے تیار کرنے کا حکم دیا۔ اور خود ستار لے کر بجانے لگا۔

دفعتہً ایک ٹرینکا[1] گاڑی گھنٹی بجاتی ہوئی سرائے کی طرف آئی۔ اور دروازے پر آکر رُک گئی۔ ایک افسر اور دو سپاہی گاڑی سے باہر نکلے۔ وہ سیدھے اکسینیف کی طرف گئے۔ اور اس سے پوچھنے لگے۔ "تم کون ہو۔ کہاں سے آئے ہو؟" اکسینیف نے اپنا پتا نشان بتایا۔ اور ازراہ تواضع ان کو چائے میں شریک ہونے کی دعوت بھی دی لیکن افسر سوالات کئے جاتا تھا۔ "تم نے رات کہاں بسر کی؟ کیا تم اکیلے تھے۔ یا تمہارے ساتھ کوئی سوداگر بھی تھا؟ کیا تم نے اسے صبح دیکھا بھی تھا؟ تم اس قدر جلدی وہاں سے کیوں چلے آئے؟"

اکسینیف حیران تھا۔ کہ افسر اسقدر سختی سے سوال کیوں کر رہا ہے؟ تاہم اس نے سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔ اور پوچھنے لگا۔ "آپ مجھ سے اسقدر سوال کیوں

---

[1] یہ ایک قسم کی گاڑی ہوتی ہے۔ جس میں تین گھوڑے جُتے ہوتے ہیں۔ ملک روس میں اسکا بہت رواج ہے

کر رہے ہیں؟ میں کوئی چور یا بدمعاش نہیں ہوں۔ اپنے کام سے جا رہا ہوں۔ کوئی وجہ نہیں کہ آپ اس طرح کرید کرید کر مجھ سے باتیں پوچھیں۔" افسر نے سپاہیوں کو بلایا اور اکسنیف سے کہنے لگا: "میں پولیس انسپکٹر ہوں۔ میں نے تم سے اس لئے سوالات کئے ہیں۔ کہ وہ سوداگر جس کے ساتھ تم نے رات بسر کی تھی۔ بستر پر قتل کیا ہوا پایا گیا ہے۔ اپنا سامان دکھاؤ۔" اور ساتھ ہی سپاہی کو حکم دیا۔ "تم دونوں اسکی تلاشی لو۔" دونو سپاہی سرائے کے اندر گئے۔ اور بیگ اور ٹرنک اٹھا لائے۔ اور پولیس کے انسپکٹر کے سامنے انہیں کھول کر دیکھنا شروع کیا۔ یکایک پولیس انسپکٹر نے ایک بیگ میں سے چاقو نکالا۔ اور شاہانہ انداز تحکم سے کہنے لگا۔ "یہ چاقو کس کا ہے؟" اکسنیف خوفزدہ ہو کر چاقو کی طرف دیکھنے لگا۔ جو خون سے رنگا ہوا تھا۔ اور اسکے بیگ سے برآمد ہوا تھا۔

"چاقو پر یہ کس کا خون لگا ہوا ہے؟"

اکسنیف نے جواب دینے کی کوشش کی۔ لیکن صاف طور پر بول نہ سکا۔

"میں .... میں .... نہیں .... جانتا .... میں .... یہ میرا .... چاقو .... نہیں ہے۔"

انسپکٹر بولا "آج صبح سوداگر اپنے بستر پر قتل کیا ہوا پایا گیا ہے۔ اور تمہارے سوا یہ کسی کا کام نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ سرائے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اور تمہارے سوا اور کوئی سرائے میں نہیں تھا۔ اور یہ خون آلود چاقو بھی تمہارے ہی بیگ سے نکلا ہے اور اسکے علاوہ تمہارا چہرہ تمہارے جرم کی شہادت دیتا ہے۔ مجھے صاف صاف بتلاؤ۔ کہ تم نے کس طرح قتل کیا ہے۔ اور کتنا روپیہ چرایا ہے؟"

اکسنیف نے قسم کھائی۔ کہ اس نے یہ کام نہیں کیا۔ اور اس نے سوداگر کے ساتھ چائے پینے کے بعد اسے نہیں دیکھا۔ اور جو آٹھ ہزار روبلس (روس کا ایک سکہ)

اس کے پاس ہیں۔ وہ خود اسکے ہیں۔ اور چاقو اسکا نہیں۔ اسکی آواز کانپ رہی تھی۔ اور چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ اور سارا جسم ایک مجرم کے مانند خوف سے کانپ رہا تھا۔ پولیس انسپکٹر نے سپاہیوں کو حکم دیا۔ کہ اکسنیف کو حراست میں کرلیں۔ اور گاڑی میں لے جائیں۔ جب وہ اسکے ہاتھ پاؤں باندھ کرنے چلے تو اکسنیف بے اختیار رونے لگا۔ انہوں نے اکسنیف کا روپیہ اور سامان ضبط کرلیا۔ اور اُسے دوسرے شہر میں لے جاکر حوالات میں بند کردیا۔

انہوں نے ولیڈی میر میں اکسنیف کے چال چلن کے متعلق تحقیقات کی۔ تمام سوداگروں اور شہر والوں نے بیان کیا۔ کہ اکسنیف عہد جوانی میں شراب پیتا تھا۔ اور اتنی پیتا تھا۔ کہ بیہوش ہوجاتا تھا۔ لیکن آج کل وہ نہایت شریفانہ زندگی بسر کرتا ہے جب وہ عدالت میں لایا گیا۔ تو اس پر قتل اور بیس ہزار روبل چرانے کا جرم لگایا گیا۔

اکسنیف کی بیوی نے جب اس واردات کا حال سُنا۔ تو دنیا اسکی آنکھوں میں اندھیر ہوگئی۔ اور وہ نہیں جانتی تھی۔ کہ کیا کرے۔ اسکے بچے ابھی بالکل چھوٹے تھے۔ ایک دودھ پیتا تھا۔ وہ سب بچوں کو لے کر جس شہر میں اسکا شوہر قید تھا گئی۔ اول اول اُسے شوہر سے ملنے کی اجازت نہ ملی۔ لیکن بعد ازاں داروغہ نے اسے اجازت دے دی۔ اور وہ اکسنیف کے پاس پہنچگئی۔ جب اُس نے اکسنیف کو قیدیوں کے لباس میں دوسرے قیدیوں کے ساتھ پا بہ زنجیر دیکھا تو وہ غش کھاکر زمین پر گر پڑی۔ اور بڑی دیر کے بعد ہوش میں آئی۔ اس نے بچوں کو اپنے گرد بٹھالیا۔ اور آپ اُنکے درمیان بیٹھ کر گھر کے حالات بیان کرنے لگی۔ اور پھر اکسنیف سے کل ماجرا بیان کرنے کو کہا۔ اس نے سارا قصہ من وعن سُنا دیا۔ بیوی نے پوچھا "اسکا انجام کیا ہوگا" اس نے جواب دیا۔ ہمیں شہنشاہ زار کی خدمت میں عرضی بھیجنی چاہیئے۔ یہ ایک غیر ممکن بات ہے۔ کہ کسی بیگناہ شخص کو سزا ملے"

بیوی نے جواب دیا۔ کہ اس نے زار کو ایک عرضی لکھی لیکن وہ منظور نہیں ہوئی

اکسینیف نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن اسکا دل اس ناقابلِ برداشت صدمہ سے ٹوٹ گیا۔ اس کی بیوی بولی "اب تو تم نے خواب کی تعبیر دیکھ لی ہے جب میں نے خواب دیکھا تھا کہ تمہارے سر کے بال سفید ہو گئے ہیں۔ تو میرے دل میں اسی وقت خیال آیا تھا۔ کہ خدا نہ کرے کوئی نہ کوئی بات ضرور ہو کر رہیگی۔ اب تمہارے بال غم کی وجہ سے سفید ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ تم کو چاہیئے تھا کہ اسوقت گھر رہتے"

وہ اپنے بال نوچ نوچ کر رونے لگی۔ پھر اس نے پوچھا "میرے پیارے شوہر اپنی بیوی سے سچ سچ کہہ دو۔ کہ تم اس جرم کے مرتکب ہوئے ہو یا نہیں؟" اکسینیف نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "آہ..... تم بھی مجھ پر شبہ کرتی ہو؟" یہ کہہ کر زار و قطار رونے لگا۔ اتنے میں ایک سپاہی آیا۔ اور اکسینیف کے بیوی بچوں کو چلے جانے کا حکم دیا۔ اس نے آخری بار ان کو الوداع کہی۔

جب اسکی بیوی چلی گئی۔ تو وہ اسکی باتوں پر غور کرنے لگا۔ جب اسے خیال آیا۔ کہ اسکی بیوی نے بھی اسکا اعتبار نہیں کیا۔ اور پوچھا کہ تم نے سوداگر کو قتل کیا ہے۔ یا نہیں۔ تو وہ اپنے جی میں کہنے لگا۔ "یہ ظاہر ہے۔ کہ سوائے خدا کے اور کوئی اصل واقعہ کو نہیں جان سکتا۔ خدا ہی ہے۔ جو میں بیگناہ اس آفت سے بچ نکلوں"

اسوقت سے اکسینیف نے عرضیاں لکھنے کا ارادہ ترک کر دیا اور رہائی کی امید چھوڑ دی۔ وہ صرف خدا کی عبادت کرتا رہا۔ اکسینیف کو سزائے تازیانہ اور جلاوطنی کا حکم ہوا۔ اس حکم کی تعمیل کی گئی۔ اس کو تازیانے لگائے گئے۔ اور جب زخم بھر گئے تو دوسرے قیدیوں کے ساتھ سائبیریا بھیج دیا گیا۔

وہ زمین دوز قید خانے میں چھبیس برس رہا۔ اسکے سر کے بال برف کے مانند سفید ہو گئے تھے۔ اور اسکی داڑھی بھی گھنی لمبی اور سفید ہو گئی تھی۔ اسکا دل جو ہمیشہ خوشی اور زندہ دلی سے لبریز رہتا تھا بجھ گیا تھا۔ وہ بہت کم بولا کرتا تھا۔

اور کبھی نہیں ہنستا تھا۔ وہ اپنا سارا وقت عبادت میں صرف کیا کرتا تھا۔ جیل خانے میں اکسنیف نے بوٹ بنانے سیکھ لئے تھے اور جو روپیہ اس نے اس کام میں کمایا تھا اسکی دو کتاب الشہدا" خریدلی تھی۔ جب جیل خانہ میں کافی روشنی ہوتی۔ تو وہ اس کتاب کا مطالعہ کرتا تھا۔ اور مقدس ایام میں جیل کے گرجا میں جاکر انجیل کی تلاوت کرتا۔ اور خدا کی تعریف گانے والوں کے ساتھ مل کر گاتا۔

تمام حاکم اس کے انکسار کی وجہ سے اسے بہت پسند کرتے تھے اور اس کے ساتھ کے تمام قیدی اس کی تعظیم کرتے۔ اور اسے "داد" اور "خدا کا نیک بندہ" کہہ کر پکارتے تھے۔ اور جب انہیں کوئی عرضی حاکم کی خدمت میں پیش کرنی ہوتی تھی۔ تو وہ اکسنیف کو منتخب کرتے تھے۔ کہ ان کی گذارشوں کو حاکموں کے پاس لیجاتے اور جب قیدیوں کا آپس میں جھگڑا ہو جاتا تو وہ ہمیشہ اکسنیف کو ثالث بناتے تھے۔ اکسنیف کو گھر سے کوئی خط نہیں ملا تھا۔ اور اسے معلوم نہیں تھا۔ کہ اسکی بیوی بچے زندہ ہیں یا نہیں۔

ایک دفعہ چند نئے قیدی جیل خانہ میں داخل ہوئے۔ شام کو سب پرانے قیدی نئے قیدیوں کے گرد جمع ہو گئے۔ اور ان سے سوالات کرنے لگے۔ کہ وہ کس ملک یا گاؤں سے آئے ہیں۔ اور کن جرائم کی پاداش میں سائبیریا بھیجے گئے ہیں؟

اس وقت اکسنیف نو آمد قیدیوں کے نزدیک ایک سٹول پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ ان نئے قیدیوں میں سے ایک آدمی جو نہایت مضبوط اور جسیم تھا جس کی عمر کوئی ساٹھ سال کے قریب ہوگی اور جسکی ڈاڑھی نہایت لمبی اور سفید تھی جو بتلا رہا تھا۔ کہ وہ کیوں پکڑا گیا ہے ـــــ "اے بھائیو۔ میں یہاں بیگناہ بھیجا گیا ہوں۔ میں ایک پوسٹ مین کی گاڑی سے ساز اتار رہا تھا۔ کہ انہوں نے مجھے پکڑ لیا کہ میں چرا رہا تھا لیکن میں سچ کہتا ہوں۔ کہ میں صرف تھوڑی دور جانا چاہتا تھا۔ اس لیئے میں نے گھوڑے کو چابک

لگایا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے کہا کہ کوچوان میرا دوست ہے مگر وہ کہتے تھے۔ کہ تم چوری کر رہے تھے۔ لیکن انہیں معلوم ہی نہیں۔ کہ میں نے کیا کیا جرائم کئے ہیں۔ میں نے وہ وہ کام کئے ہیں۔ کہ آج سے مدتوں پہلے یہاں ہوتا۔ لیکن پکڑا نہیں گیا۔ اب انہوں نے بلا انصاف مجھے یہاں بھیج دیا ہے۔ لیکن گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں پہلے بھی یہاں آچکا ہوں۔ اور انہوں نے مجھے زیادہ مدت تک نہیں رکھا۔ اگرچہ.....

"تم کس جگہ سے آئے ہو؟" ایک قیدی نے پوچھا۔

"ہم ولیڈی میر سے آئے ہیں۔ اور ہم وہیں کے باشندے ہیں۔ میرا نام میکار ہے۔ اور میرے باپ کا نام سیمتین تھا۔"

اکسینیف نے سر اٹھا کر پوچھا۔ "مجھے بتاؤ کیا تم نے اکسینیف کے بیٹوں کی نسبت بھی کچھ سنا ہے۔ جو ولیڈی میر کے سوداگر ہیں؟..... کیا وہ زندہ ہیں؟"

"بیشک میں نے ان کی نسبت سنا ہے۔ وہ مالدار سوداگر ہیں۔ اگرچہ ان کا باپ سائبیریا میں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ وہ بھی ہم جیسا گنہ گار ہے..... اب دادا مجھے بتاؤ کہ تم یہاں کیوں آئے؟"

اکسینیف اپنی بدقسمتی کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ "چھبیس برس سے اپنے گناہوں کی سزا بھگت رہا ہوں۔"

میکار نے پوچھا۔ "لیکن آپ کا جرم کیا ہے؟"

اکسینیف نے جواب دیا۔ "مجھے ضرور اس سزا کا مستحق ہونا چاہئے تھا۔"

اکسینیف نے اس سے زیادہ ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا۔ دوسرے قیدیوں نے بتلایا کہ کس طرح اکسینیف سائبیریا آیا۔ اور کس طرح ایک سوداگر کو کسی نے قتل کر کے چاقو اکسینیف کے اسباب میں رکھ دیا تھا۔ اور کس طرح اسے بے انصافی سے سزا ملی۔ جب میکار نے یہ سنا تو اس نے اکسینیف کی طرف دیکھا۔ اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا۔ "خوب

یہ نہایت عجیب معاملہ ہے۔ دادا آپ بہت بوڑھے ہو گئے ہوں گے۔

قیدیوں نے میکار سے پوچھنا شروع کیا کہ وہ کس خیال سے متعجب ہو رہا ہے؟ اور کیا اس نے اکسینیف کو پہلے کہیں دیکھا ہے؟

لیکن میکار نے ان الفاظ کے سوا کچھ نہ کہا۔ "دوستو! ایک اچنبھا! کس قدر عجیب بات ہے۔ کہ ہم دوبارہ آپس میں ملے ہیں۔"

جب اس نے یہ الفاظ کہے تو اکسینیف نے خیال کیا کہ یہ شاید سوداگر کے قاتل کو جانتا ہو۔ اس لئے اس نے پوچھا۔ "کیا تم نے کبھی اس واردات کی نسبت کچھ سنا ہے۔ یا کبھی تم نے مجھے دیکھا ہے؟"

"ہاں میں نے سنا تھا۔ تمام شہر میں یہی چرچا تھا۔ لیکن یہ مدت کی بات ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کیا سنا تھا۔"

شاید تم نے قاتل کی نسبت بھی سنا ہو؟"

میکار ہنسا اور کہنے لگا۔ "کیوں بے شک جس شخص کے بیگ میں چاقو تھا۔ اسی نے قتل کیا۔ بھلا تمہارے اسباب میں کوئی چاقو رکھ دے۔ اور پکڑا نہ جائے۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ کس طرح تمہارے بیگ میں چاقو رکھ سکتے تھے۔ کیا تمہارے سر کے قریب کوئی کھڑا ہوا نہیں تھا؟ کیا تم نے اسکے متعلق نہیں سنا؟"

جیسے ہی اکسینیف نے یہ الفاظ سنے اسے یقین ہو گیا۔ کہ یہی وہ شخص ہے جس نے سوداگر کو قتل کیا تھا۔ اور وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ اسے ساری رات نیند نہ آئی۔ وہ نہایت مغموم ہو گیا۔ اور گذشتہ واقعات کو یاد کرنے لگا۔ تخیل میں اسے اپنی بیوی نظر آئی۔ اس کی حالت بالکل ویسی ہی تھی۔ جب کہ وہ آخری مرتبہ اسے دیکھنے کے لئے جیل خانہ میں آئی تھی۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ سچ مچ اس کے سامنے کھڑی ہے۔ اسے اس کی آنکھیں اور چہرہ صاف نظر

آرہا تھا۔ اور اس کے الفاظ کانوں میں گونج رہے تھے۔ پھر اس نے تخیل میں اپنے بچوں کو سامنے کھڑے ہوئے دیکھا۔ ایک لڑکا سمور کا کوٹ پہنے تھا۔ دوسرا ماں کی گود میں تھا۔ پھر اسے وہ وقت یاد آیا جبکہ وہ خوش اور نوجوان تھا۔ اسے یاد آیا کہ کس طرح وہ سیڑھیوں پر بیٹھا تھا۔ کہ اسے گرفتار کر لیا گیا۔ اسوقت اس کی روح کس قدر بشاش تھی۔ جب وہ ستار بجا رہا تھا۔ پھر اسے وہ جگہ یاد آئی۔ جہاں پر اُسے تازیانے لگائے گئے تھے۔ پھر چھبیس برس جیل میں کاٹنے کے واقعات یکے بعد دیگرے آئے۔ اسکے بعد اسے اپنا بڑھاپا یاد آیا۔ وہ رنج کی وجہ سے اس درجہ بیقرار ہو گیا کہ زندگی کو موت پر ترجیح دینے لگا۔ اور "یہ سب کچھ اس بدمعاش کی وجہ سے" اس نے اپنے دل میں کہا۔ پھر اُسے میکار پر اسقدر غصہ آیا۔ کہ اگر اسکا اختیار ہوتا تو وہ اس کو اسی وقت مار ڈالتا۔ وہ انتقام لینے کے لئے بہت بیقرار تھا وہ ساری رات عبادت میں مصروف رہا۔ لیکن اس کی روح کو تسلی نہ ہوئی۔ جب دن چڑھا۔ تو وہ میکار کے پاس سے گزر گیا۔ لیکن اس کی طرف بالکل نہ دیکھا۔ اسی طرح دو ہفتے گذر گئے۔ لیکن اکسنیف کو اس عرصہ میں بالکل نیند نہ آئی۔ اس کا اضطراب اس درجہ بڑھا ہوا تھا۔ کہ وہ نہیں جانتا تھا کہ کیا کرے۔

ایک رات جب وہ کسی ضرورت سے جیل خانہ میں سے ہو کر گذر رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اُس کے بوٹ کی ایڑی ایک تختہ پر پاؤں رکھنے سے ہل رہی ہے۔ وہ اسے دیکھنے کے لئے ٹھہر گیا۔ دفعتہً میکار تختہ کو سرکا کر نیچے سے نکل آیا۔ اور اکسنیف کی طرف خوف اور غصہ کی نظروں سے دیکھنے لگا۔

اکسنیف آگے بڑھنے ہی کو تھا۔ کہ میکار نے اُسے بازوؤں سے پکڑ لیا اور اسے بتایا۔ کہ کس طرح وہ دیوار میں گذرنے کے لئے راستہ بنا رہا ہے۔ اور کس طرح ہر روز مٹی کو اپنے بوٹوں میں بھر کر لے جاتا ہے۔ اور کس طریق پر وہ کام کرنے کے

لئے باہر جاتا ہے اور بازار میں مٹی پھینک دیتا ہے۔ اسکے بعد وہ کہنے لگا۔ "بوڑھے آدمی اگر تم صرف اپنی زبان بند رکھو۔ تو میں تمہیں بھی باہر نکال لونگا۔ لیکن اگر تم نے کسی سے کہہ دیا تو مجھے کوڑے لگیں گے۔ لیکن بعد ازاں میں تمہاری اچھی طرح خبر لوں گا..... میں تم کو جان سے مار ڈالوں گا۔"

جب اکسینیف نے اپنے دشمن کو دیکھا۔ تو اسکا سارا جسم غصے اور جوش سے کانپنے لگا۔ اس نے جھٹکا دے کر اپنے بازوؤں کو چھڑا لیا۔ اور کہنے لگا۔ "کوئی وجہ نہیں۔ کہ میں بھاگنے کی کوشش کروں۔ اور مجھے مارنے سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ تم مجھے عرصہ سے مار چکے ہو۔ رہا تمہارا راز کسی سے کہنے یا نہ کہنے کے متعلق میں وہی کروں گا۔ جو خدا کو منظور ہو گا۔"

دوسرے دن جب قیدی باہر کام پر گئے ہوئے تھے۔ تو سپاہیوں کو اس جگہ کا پتہ معلوم ہو گیا۔ انہوں نے تلاش کرنا شروع کیا۔ اور ایک شگاف کا کھوج لگا لیا۔ چیف جیل خانہ میں آیا اور ہر ایک قیدی سے پوچھنے لگا۔ "وہ شگاف کس نے کیا ہے؟" لیکن سب نے لاعلمی ظاہر کی۔ وہ قیدی جو جانتے تھے۔ انہوں نے بھی میکار کا نام نہ بتایا۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا۔ کہ اس قسم کے قصور پر انہیں اس قدر کوڑے لگیں گے۔ کہ وہ ادھ موئے ہو جائینگے۔ چیف اکسینیف کے پاس آیا وہ جانتا تھا۔ کہ اکسینیف راست گو آدمی ہے۔ اس سے اس نے پوچھا۔ "بوڑھے آدمی خدا کو حاضر ناظر جان کر کہو یہ کس کی کارروائی ہے؟"

میکار پاس ہی نہایت پریشان صورت بنائے کھڑا تھا۔ اسے اکسینیف کی طرف دیکھنے کا حوصلہ بھی نہ پڑتا تھا۔ اکسینیف کے ہاتھ اور ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اس سے پہلے وہ کہہ سکتا تھا۔ مگر اب نہیں۔ اس نے اپنے دل میں کہنا شروع کیا۔ "اگر میں اسے بچالوں ——— لیکن کیا میں اسے معاف کر سکتا ہوں؟

کیا وہ میری بربادی کا باعث نہیں ہوا؟ جب میں نے اپنی تکلیفیں جھیلی ہیں۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ اسے ضرر نہ پہنچے۔ لیکن کیا میں اسکا نام بتا دوں گا؟ کیا یہ مجھ سے ہو سکیگا؟ کیا وہ اسے یقیناً مار ینگے۔ کیا اس سے کچھ فائدہ ہوگا؟ کیا میرے لئے کچھ آسانی ہو جائیگی؟"

دوبارہ چیف نے تحکمانہ انداز سے پوچھا ــــ "ہاں پیر مرد سچ بتاؤ۔ کس نے دیوار میں شگاف کیا ہے؟"

"میں ہرگز نہیں بتاؤں گا۔ آپ جو چاہیں کریں۔ میں آپ کی طاقت میں ہوں۔"

"چیف کی تمام کوششوں کے باوجود اکسنیف نے اس سے زیادہ کچھ نہ کہا اور وہ چور کو معلوم کرنے میں ناکام رہے۔

دوسری رات اکسنیف اپنے تختہ پر لیٹا اونگھ رہا تھا۔ تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ کوئی اس کے پاس آیا ہے۔ اور اسکے پاؤں کے پاس بیٹھ گیا ہے۔ اس نے اندھیرے میں نظر اٹھا کر دیکھا۔ تو میکار دکھائی دیا۔ اکسنیف نے پوچھا۔

"تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ یہاں کیا کر رہے ہو؟"

میکار خاموش رہا۔

اکسنیف کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔ "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ چلے جاؤ یہاں نہیں تو میں پہرہ دار کو بلا لوں گا۔"

میکار اسکے اور قریب ہو گیا اور آہستہ سے کہنے لگا۔ "اکسنیف مجھے معاف کر دو۔"

اکسنیف بولا۔ "تم نے میرا کیا قصور کیا ہے۔ جو میں تمہیں معاف کر دوں۔"

"وہ میں ہی تھا جس نے سوداگر کو قتل کیا۔ اور چاقو تمہارے بیگ میں چھپا دیا۔ اور خود کھڑکی کی راہ سے کود کر بھاگ گیا۔"

اکسنیف نے کچھ جواب نہ دیا۔

میکار اس کے تختہ سے نیچے اُتر آیا۔ اور زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر کہنے لگا۔ "مجھے معاف کردو۔ خدا کے لئے معاف کردو۔ میں اقرار کرلوں گا۔ کہ میں نے سوداگر کو قتل کیا تھا ـــــ وہ تمہیں چھوڑ دیں گے۔ تم گھر جا سکو گے۔"

اکسنیف بولا۔ "تمہارے لئے یہ کہہ دینا آسان ہے لیکن میں اسے کیا کروں ..... اب میں کہاں جا سکتا ہوں ..... میری بیوی مرگئی ..... میرے بچوں نے مجھے بھلا دیا ..... میرے لئے جانے کو کوئی جگہ نہیں۔"

میکار نہ اٹھا۔ اُس نے اپنے سر کو زمین پر دے مارا۔ اور کہنے لگا۔ "اکسنیف مجھے معاف کردو۔"

جب وہ مجھے باندھ کر تازیانے لگائیں گے۔ تو میں بہ آسانی برداشت کرلوں گا۔ اب تمہیں دیکھنے کے ..... اور تم نے باوجود ان باتوں کے مجھ پر رحم کیا ہے ..... تم نے میرا نام نہیں بتایا۔ خدا کے لئے معاف کردو۔ اگرچہ میں ایک بدبخت گنہگار ہوں۔

میکار سسکیاں لینے لگا۔ جب اکسنیف نے اس کو اس طرح روتے دیکھا وہ خود بھی رو پڑا۔ اور کہنے لگا۔ "خدا تم کو معاف کردیگا۔ میں تم سے سو درجہ بُرا ہوں۔"

دفعتہً اسکی روح کو عجب قسم کی راحت محسوس ہوئی۔ اس نے گھر جانے کی فکر بالکل چھوڑ دی۔ اور اسے جیلخانہ چھوڑنے کی کوئی خواہش نہ رہی۔ مگر صرف اسے اپنے آخری وقت کا خیال رہا۔

میکار نے اسکی ایک نہ سُنی اور جرم کا اقرار کرلیا۔ لیکن جب سپاہی اکسنیف کو آزاد کرنے آئے۔ تو اس کو دنیا کی ہر قید سے آزاد پایا۔

گرگٹ

(مترجمہ سید بشیر الدین صاحب بی۔اے علیگ)

جون پور کے بڑے بازار کی پشت پر جنوب کی طرف ایک چھوٹا سا بازار ہے۔ بڑا بازار چونکہ قریب ہی ہے۔ خرید و فروخت اس بازار میں کم ہوتی ہے چنانچہ اس وقت بھی سکون کا عالم ہے۔ کافی وقفے کے بعد اِکے دکے راہ گیر کا گذر ہو جاتا ہے۔ دُکانداروں میں کوئی اونگ رہا ہے۔ کوئی زانو پر کہنی ٹیکے ہوئے ٹکٹکی باندھے سڑک کی طرف دیکھ رہا ہے۔ دروازے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گویا اسکے ہُو کے عالم کا نظارہ کر رہے ہیں کسی فقیر کا بھی گذر اس طرف نہیں ہوتا۔

ممتاز خاں پولیس انسپکٹر ایک گلی میں سے نِکلا۔ بھورا رنگ۔ دراز قد۔ کوٹ کے بٹن کھلے ہوئے ہاتھ میں چھڑی لئے اور چھڑی کو ہوا میں گھماتے ہوئے۔ نہایت وقار کے ساتھ ناک کی سیدھ میں چلا جا رہا ہے۔ ایک کانسٹبل پھولوں کی ٹوکری لئے ہوئے اسکے ساتھ ہے۔

"ٹھہر جا، مردود! کاٹ کر بھاگتا ہے کہاں تک جائیگا؟ تیری گردن نہ مروڑ دوں جب ہی سہی۔ لڑکوا سے جانے نہ دو۔ کُتّوں کا کاٹنا جُرم ہے"۔ "ہاں جُرم ہے" کہتے ہُوئے کسی کی آواز آئی۔ مڑکر جو دیکھا۔ تو انسپکٹر ممتاز کو ایک کُتّا نظر آیا جو ابھی ابھی ایک ٹانگ اُٹھائے باقی تین ٹانگوں پر اُچھلتا ہُوا پاس کی لکڑی کی ٹال میں سے نِکلا۔ نذیر اسکا پیچھا کر رہا ہے۔ آگے کی طرف بڑھ کر کتّے کی پچھلی ٹانگیں پکڑ کر جھنجھوڑ رہا ہے۔ کُتّے کے بھونکنے کی آواز پھر آئی۔ "جانے نہ دو مردود کو"۔

دُکان دار گویا نیند سے یک لخت بیدار ہوئے۔ تھوڑی دیر میں ایک انبوہ کثیر

گویا زمین سے اُبل پڑا۔ "حضور معلوم ہوتا ہے کوئی فساد ہو رہا ہے"۔ کانسٹبل نے کہا۔

ممتاز خاں مجمع کی طرف روانہ ہُوا۔

نذیر اپنا داہنا ہاتھ اوپر کو اُٹھائے ہوئے کھڑا ہے۔ اور اس کی ایک انگلی سے خون جاری ہے۔ انتقام کی بُو اس کی ہر حرکت سے آرہی ہے۔ اُس کا ہاتھ اوپر کی طرف اٹھانا ہی گویا فتح کی جھنڈی ہلانا ہے۔ دریافت کرنے پر ممتاز خاں کو معلوم ہُوا کہ یہ شخص نذیر سُنار ہے۔ مجرم جس کا وہ تعاقب کر رہا تھا۔ ایک چھوٹا ٹیریر کُتّا تھا۔ جو زمین پر بیٹھا ہانپ رہا تھا۔ اسکے جسم پر لرزہ تھا۔ خوف و مصیبت اس کی ہر حرکت سے عیاں تھی۔

ممتاز خاں لوگوں کو ہٹاتا ہُوا داخل ہُوا اور پوچھنے لگا۔ کیا ماجرا ہے۔ تم لوگ یہاں کس لئے جمع ہو؟ اس قدر غُل کیوں مچا رکھا ہے؟"

"حضور میں لکڑیاں لئے ہوئے خاموش ادھر سے گزر رہا تھا" کھانستے ہوئے نذیر نے کہنا شروع کیا۔ "اتنے میں اسے کُتّے نے بے چھیڑے میری انگلی پر دانت مارے۔ میں مزدور پیشہ آدمی ہوں۔ ایک ہفتہ تک اس انگلی کی وجہ سے کام کرنا مشکل ہے۔ میں تاوان کا دعویٰ کروں گا۔ کتّوں کا کاٹنا۔ حضور جانتے ہیں جُرم ہے۔ کتّوں کا کُھلا چھوڑنا بھی خلافِ قانون ہے۔ اگر ہر شخص اپنے کتّوں کو اس طرح کُھلا چھوڑنے لگا۔ تو زندگی دوبھر ہو جائے گی۔ چلنا پھرنا ناممکن ہو جائیگا۔

کھانستے ہوئے ممتاز نے سختی کے ساتھ کہا۔ "اچھا یہ بتاؤ یہ کُتّا ہے کس کا؟ میں اُسے کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ اِن قانون شکن شہر فاکی میں خوب خبر لوں گا۔ کتّوں کو یوں چھوڑ دینا کیا معنی رکھتا ہے۔ ابھی ان کو معلوم ہو

جائیگا۔" اعجاز کانسٹبل کی طرف مخاطب ہو کر۔" اعجاز یہ کتا کس کا ہے؟ فوراً پتہ چلاؤ اور رپورٹ لکھو۔ اسے گولی ماردی جائے گی۔ تم میں سے کسی کو معلوم ہے یہ جانور کس کا ہے؟"

مجمع میں سے کوئی شخص بولا۔" میرے خیال میں یہ کتا مسٹر فاکس کلکٹر ضلع کا ہے"۔

"کلکٹر صاحب کا؟ اچھا، اعجاز، ذرا میرا کوٹ تو اتارنا کس قدر شدت کی گرمی ہے۔ شاید برسے گا۔ میری سمجھ میں ایک بات اب تک نہیں آئی۔ اس نے تمہیں کاٹا کس طرح۔ اب ممتاز خاں کا خطاب نذیر سنار سے تھا۔" اتنا چھوٹا سا کتا اور تمہارا قد اتنا لمبا۔ یہ انگلی تک پہنچا کیوں کر؟ تم صریحاً جھوٹ بول رہے ہو۔ انگلی میں کسی اور طرح چوٹ لگ گئی ہوگی۔ تاوان کا خیال دماغ میں خوب سمایا۔ میں تم لوگوں کی حرفتوں کو خوب سمجھتا ہوں"

"حضور یہ شخص جھوٹا ہے۔ مفتری ہے۔ کتے کو اس نے بلاوجہ چھیڑا۔ آخر جانور ہی تو ہے۔ اس کے ہاتھ پر جھپٹا اور انگلی کاٹ لی"

"گویا آپ نے دیکھا ہی تو ہے۔ کیوں خواہ مخواہ گناہ اپنے سر لیتے ہو۔ میں جھوٹا ہوں یا تم۔ ابھی فیصلہ ہوا جاتا ہے۔ انصاف اندھا نہیں ہے"

"بس بس، بحث مت کرو" اب کانسٹبل سے بھی رہا نہ گیا۔ اس نے بھی اپنی رائے دی۔" گستاخی معاف، انسپکٹر صاحب، یہ ناممکن ہے۔ صاحب بہادر ایسے معمولی کتے ہرگز نہیں پالتے۔ ان کے ہاں ایک سے ایک اعلیٰ قسم کا کتا موجود ہے"

"کیا تم ٹھیک جانتے ہو کہ یہ کتا کلکٹر صاحب کا نہیں ہے؟" انسپکٹر نے سوال کیا۔" جی ہاں حضور"

"ہاں۔ مجھے بھی یقین ہے کہ یہ کتا اُن کا نہیں ہو سکتا۔ اُن کے یہاں سوائے شکاری کتوں اور بلڈاگ کے اور کسی قسم کا کتا ہی نہیں۔ یہ کہیں کا معمولی بازاری کتا معلوم ہوتا ہے۔ یہ ہرگز ان کا نہیں ہے۔ ایسے کتے بھلا وہ کیوں پالنے لگے تھے۔ نذیر اس نے تمہیں کاٹا ہے۔ اس کے مالک کے خلاف مقدمہ دائر کیا جائے گا۔ اور تم تاوان کے مستحق ہو۔ یہ معاملہ یونہی نہیں چھوڑا جائیگا۔"

"مگر سنئے تو حضور، ممکن ہے یہ کتا انہیں کا ہو۔ کچھ عرصہ ہوا۔ میں نے ایسا ہی ایک کتا ان کے ہاں دیکھا تھا۔"

مجمع میں سے ایک شخص نے چلا کر کہا۔ "یہ کتا کلکٹر صاحب ہی کا ہے۔"

میرا کوٹ کہاں ہے؟ اعجاز مجھے کوٹ تو پہناؤ۔ سرد ہوا چلنے لگی۔ مجھے زکام کی شکایت ہے۔ تم اس کتے کو کلکٹر صاحب بہادر کی خدمت میں لے جاؤ۔ اور کہنا کہ مجھے یہ سڑک پر مارا مارا پھرتا ملا۔ یہ بھی عرض کرنا کہ ملازموں کو کتوں کی ذرا زیادہ خبر گیری کرنے کا حکم دیں۔ ہر شخص کتوں کو چھیڑنے کی جرأت کرنے لگا ہے۔ چلے جاؤ تم بدمعاش! لوگوں کو دھوکا دینے کے گر خوب سیکھے ہیں۔ قصور اپنا اور الزام دھرتے ہو کتے بچارے پر۔ تمہاری ایک نہیں سنی جائے گی۔" اتنے میں دوسری طرف سے کلکٹر صاحب کا خانساماں آتا ہوا نظر آیا۔

"سلام علیکم۔ میاں نورخاں یہ تو بتاؤ یہ کتا تمہارا ہی ہے نا؟

"جی نہیں۔ ہمارے ہاں ایسا کتا کبھی نہیں تھا۔"

انسپکٹر صاحب چیں بجبیں ہو کر زور سے کہنے لگے۔ "فضول وقت کیوں ضائع کرتے ہو؟ کہہ دیا کہ یہ بازاری کتا ہے۔ بے معنی بحث مباحثے سے کیا نتیجہ اس کتے کو گولی مار دی جائے گی۔ بس جھگڑا ختم۔"

اتنے میں نور خاں بولا "کتا ہمارا تو نہیں ہے۔ مگر کلکٹر صاحب کے بھائی چھٹی پر آئے ہوئے ہیں اُن کا ہے"۔

"واقعی؟ کب آئے۔ میری تو اُن سے ملاقات ہے۔ میں ان سے ضرور ملونگا اچھا تو یہ کتا اُن کا ہے۔ اعجاز لے جاؤ۔ کیا پیارا جانور ہے۔ لوگوں کو بیٹھے بٹھائے سوجھتی خوب ہے! کتے نے کاٹ لیا۔ یہ کاٹ ہی نہیں سکتا۔ جھوٹ بولنے سے باز آؤ۔ تاوان کی ایک ہی رہی! اب تاوان کا دعویٰ تم پر دائر کیا جائیگا"۔

یہ کہتے ہوئے انسپکٹر صاحب نے کوٹ سنبھالا اور اپنی راہ لی +

ملنے کا پتہ

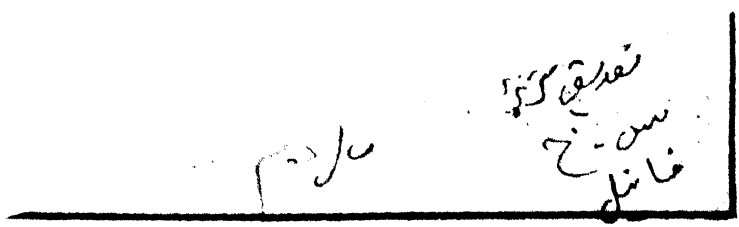

تصدیق گردید
سن ـ خ
فاضل

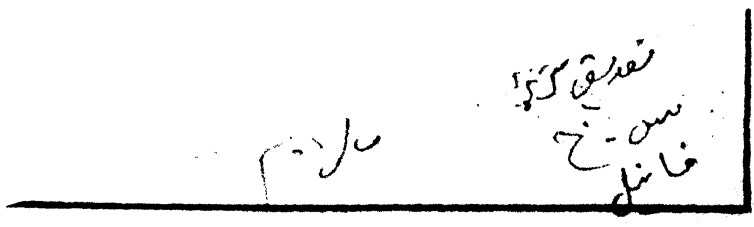

تصدیق کرتا

حسن خ

فاضل

[illegible]